"داستانِ اردو" کا ایک دلچسپ باب

مغل اور اردو



از

ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیالؔ

پہلا ایڈیشن ۱۰۰۰ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

محمد نجم الدین تاجر کتب فروش [illegible] آباد دکن

داستانِ اردو کا ایک دلچسپ باب

مغل اور اردو

از

ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال مدظلہ

ادیب الملک، نواب سید نصیر حسین خان بہادر صاحب "خیال"



مختصر سوانح ادیب الملک

ہمارے ادیب الملک پٹنہ عظیم آباد (صوبۂ بہار) کے ایک نہایت موقر و قدیم خاندان میں ۱۸۹۸ء کے مارچ میں بروز نوروز (۲۱ مارچ) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد نواب سید نوروز حسین خاں بعالم جوانی آپ کو تین سال کا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی دادی نواب فاطمہ بیگم صاحبہ اس وقت حیات تھیں۔ اپنے یتیم پوتے کی پرورش و تربیت انھوں نے اپنے ذمہ لی۔ یہ بیگم صاحبہ، نواب محمد عیسیٰ خاں کی صاحبزادی، پانی پت اور دلّی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی معاشرت و آداب اور اُن کی زبان، دہلوی تھی۔ آپ کی نانی صاحبہ نواب عارفہ بیگم (بنت نواب مہدی علی خاں مہدی) بھی دہلی نژاد اور پانی پتی تھیں۔ اس کے علاوہ آپ کے دادا نواب سید محمد محسن خاں اور آپ کے نانا نواب سید محمد عباس بھی دہلوی تھے۔ یہ خاندان بچھاں اور خصوصًا دہلی سے، فرخ سیر اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں عظیم آباد آیا اور بس گیا۔ ہمارے ممدوح کے بزرگوں کو شاہان مغلیہ کی طرف سے، صوبۂ بہار میں جاگیریں اور آل تمغا عنایت ہوئے تھے۔ وہ حضرات اپنی جائداد و ریاست کے انتظام کی خاطر پورب تشریف لائے اور وہاں گھر بنا کر رہے۔ غرض آپ کا خاندان تقریبًا دو سو سال سے عظیم آباد میں مقیم اور اس شہر کی معاشرت و تہذیب اور خصوصًا وہاں کی زبان پر اثر ڈالتا اور عظیم آباد کو دہلی کا ایک نمونہ بنا تا رہا ہے۔ ایک ایسے خانوادے میں آپ کا وجود اس امر کی کافی ضمانت تھا کہ آپ کے آداب و اخلاق شریفانہ و رئیسانہ ہوں اور پھر آپ کی اردو اپنے بزرگوں کی طرح خالص اور ٹکسالی سمجھی جائے۔ چنانچہ اسی سبب سے آپ کے محلہ حاجی گنج (جہاں آپ پیدا ہوئے) اور خصوصًا آپ کے گھر کی معاشرت و تہذیب اور زبان شہر میں ہمیشہ مانی گئی اور اُس کی تقلید کی گئی۔

آپ کی عمر ابھی سات برس سے زیادہ کی نہ تھی کہ آپ کی دادی صاحبہ نے بھی رحلت کی۔

اب آپ کی پرورش و تربیت آپ کے عم محترم نواب سید جعفر حسین خاں جعفر مرحوم اور آپ کے اموئے معظم سید الشعرا جناب شاؔد علیہ الرحمہ کے ذمہ ہوئی۔ آپ کو اس وقت دستور کے مطابق، اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی۔ آپ نے اپنے تزک (مطبوعہ رسالہ جادو ڈھاکہ ۱۹۲۵ء) میں تحریر فرمایا ہے کہ "ایک عرصہ تک آپ انگریزی تعلیم سے محروم رکھے گئے" غرض بارہ تیرا برس کی عمر میں آپ فارسی کے ماہر اور عربی سے کافی آشنا ہو گئے تھے۔ انگریزی اس کے بعد حاصل کی اور اس کا شوق برابر جاری رہا۔

ادیب الملک کا خاندان رئیسانہ شان لیئے ہوئے ایک علمی و ادبی خاندان بھی تھا۔ اس لیئے نہایت کم عمری سے آپ کو علم و ادب کا شوق و ذوق رہا۔ ۱۸۹۷ء میں جبکہ آپ کی عمر سترہ سال کی تھی، شہر کے دیگر اور فضول رئیسانہ مشاغل سے الگ ہو کر آپ نے عظیم آباد سے "ادیب" نام ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ جاری کیا۔ اس رسالہ کی زبان و طرز ادا ملک گردیدہ ہو گیا۔ اس عہد میں یعنی آج سے ۳۶ سال قبل ہمارے یہاں بہت کم ایسے رسالے شایع ہوتے تھے۔ بہار اور خصوصًا عظیم آباد نے اس رسالہ ادیب کی وجہ سے خاص شہرت اور نام وری حاصل کی۔ اس رسالہ میں زیادہ تر آپ اور آپ کے دوست مولوی سید علی سجاد مرحوم (صاحب محل خانہ و نئی نویلی وغیرہ) مضامین تحریر فرماتے تھے۔ آپ کے اکثر مضامین اس رسالہ میں فرضی اور دوسروں کے نام سے بھی شایع ہو کر شہرت پاتے رہے۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کی شادی کلکتہ میں ہو گئی اور اس شہر میں قیام کی وجہ سے افسوس ہے کہ ادیب کا سا رسالہ مرحوم ہو گیا اور ملک نے اس کا ماتم کیا۔

۱۹۰۰ء سے اب تک آپ کا قیام کلکتہ میں ہے۔ اس غدار شہر میں جس وضع داری و خود داری سے آپ نے ۳۳ سال گذار دیئے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اپنے سوانح یعنی تزک خیال میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "بنگالہ اور خصوصًا کلکتہ نے مجھے کبھی غیر نہ سمجھا۔ یہ سچ ہے مگر میں کہوں گا کہ آپ نے بھی اس صوبہ اور اس شہر کو کبھی غیر نہ جانا۔ تالی دونوں ہاتھ بجی۔ ۱۹۱۲ء میں بہار و بنگال الگ ہوا۔ بہاریوں کی ایک اچھی تعداد اس وقت اپنے صوبہ کو چلی گئی۔ مگر آپ نے کلکتہ اور اپنے احباب کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ وضعداری اور احباب پرستی کی ایسی مثالیں اب اس صدی میں نایاب ہیں دنیا صرف ضرورت کو دیکھتی اور اپنی غرض کے سوا اور طرف رخ نہیں کرتی ہے۔ مگر آپ اس سے مستثنیٰ اور اپنی آپ مثال ہیں۔

کلکتہ کے قیام میں ہمارے ممدوح کے زیادہ تر مشاغل علمی و ادبی رہے۔ مگر اسی کے ساتھ آپ نے

پبلک زندگی میں بھی کافی حصہ لیا۔ کلکتہ کی تعلیمی و سیاسی تحریک میں آپ ہمیشہ شریک رہے۔ مسلم لیگ کی اگر آپ نے کلکتہ میں ایک شاخ قائم کی تو کانگریس کے بھی حامی دکھائی دیئے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامیوں میں سے رہے اور آج بھی آپ اس اتحاد کے وکلا میں سے ہیں۔ اور آپ کی یہ "داستان اردو" بھی اس کی شاہد قوی ہے۔

کلکتہ کے قیام میں یعنی ۱۹۰۹ء سے آپ کا قلم علمی و ادبی مضامین کی تحریر میں ممتاز سمجھا گیا ہے۔ اس ۳۳ سال میں آپ کی متعدد تحریریں ملک کے اخبار و رسائل میں شایع ہوئیں اور وہ سر آنکھوں پر رکھی گئیں۔ آپ کے قلم کی گردش اور آپ کے مضامین کی ندرت کا ملک نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جبکہ آپ کا ایک مضمون "خالاؤں کا مارا آغا" الہ آباد کے ایک رسالہ میں شایع ہوا تو ملک میں ایک چاؤں چاؤں مچ گئی اور کہا گیا کہ اس مضمون اور اس تحریر نے اردو کو انگریزی کا مدمقابل بنا دیا ہے!

آج تیس سال سے ملک میں آپ کے قلم کی شہرت ہے۔ اور یہ اسی شہرت کا سبب تھا کہ جبکہ لکھنؤ کے شہر میں "آل انڈیا اردو کانفرنس" کا پہلا جلسہ (۱۹۱۶ء) منعقد ہونے لگا تو آپ کو اس کی صدارت کی زحمت دی گئی۔ اس سے بہتر طور پر ملک آپ کی اور کیا قدر کر سکتا تھا۔ اس موقعہ پر آپ کا خطبہ صدارت آپ اپنی نظیر ہے۔ اس خطبہ نے ہم میں جان ڈال دی اور ہم اردو کو سمجھنے اور اسے زیادہ عزیز رکھنے لگے۔ ۱۹۱۷ء میں جبکہ بنگالہ نے "آل انڈیا تعلیمی کانفرنس" کو کلکتہ میں مدعو کرنا چاہا تو اس دعوت کے لیئے ایک عظیم الشان جلسہ اس شہر میں منعقد ہوا۔ اس صوبہ نے اس وقت اس جلسہ کی صدارت کے لیئے آپ کو زحمت دی۔ اس موقعہ پر بھی آپ کی تقریر ایک ایسی تقریر تھی جس کی نسبت اعتراف کیا گیا کہ "ایسا بیان آج تک سننے میں نہ آیا"۔ اس اسپیچ میں آپ نے ملک میں انگریزی تعلیم کی تاریخ کو وضاحت سے بیان کیا۔ اس کے حسن و قبح کو بتایا۔ اور پھر اردو سے مغائرت پر کمال افسوس ظاہر کرتے ہوئے اس ملکی زبان کی اہمیت کو دکھایا اور اس کی طرف ملک کو متوجہ کر دیا۔ یہ تقریر چھپ گئی ہے اور اہل ذوق کے پاس محفوظ ہے۔

۱۹۱۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن قائم ہوا۔ ڈاکٹر سیڈلر اس کے صدر اور جسٹس سر آشوتوش مکرجی (وائس چینسلر) کے سے شیر بنگالہ اس کے ایک خاص رکن تھے۔ اس وقت اس کمیشن میں آپ سے بھی شہادت لی گئی۔ ملک کے تعلیمی معاملات اور پھر یہاں کی زبان کے متعلق اس موقعہ پر

آپ کا بیان وہ پر مغز بیان تھا جس نے بنگالہ میں اردو کو سنبھال لیا۔ اس کمیشن نے بجا طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہمارے ممدوح کی شہادت ایک وزن رکھتی اور اردو کی بزرگی کو تسلیم کرا دیتی ہے!

سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ بطور سیر سیاحت یورپ تشریف لے گئے۔ انگلستان کے کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور انجمن یونین نے اپنے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیئے آپ کو زحمت دی۔ اس جلسہ کے ڈنر پر آپ کی اردو تقریر، اس ڈنر کے کھانوں سے زیادہ لذیذ سمجھی گئی۔ وہاں اس وقت ایک اردو انجمن قائم تھی۔ اس کے جلسہ میں بھی آپ شریک ہوئے۔ نوائے کیمبرج نام ایک اردو رسالہ وہاں سے شایع ہو رہا تھا۔ اس کے کارکنوں کے سخت اصرار سے آپ نے ایک مضمون "کیمبرج میں دو راتیں" تحریر فرمایا۔ وہ اس رسالہ میں چھپا اور ہمارا طرۂ دستار بنا۔ اس نادر مضمون میں آپ نے اپنے قاعدہ کے مطابق پہلے کیمبرج کی تاریخ بیان کی۔ پھر وہاں کی یونیورسٹی اور کالجوں کا حال تحریر کیا۔ ڈنر کی مزیدار روداد سنائی اور بعد کو مرحوم پروفیسر براؤن (مشہور مستشرق) کی ملاقات کا دلچسپ حال یوں قلمبند کر دیا کہ جس نے اس مضمون کو پڑھا آج تک اسے یاد کرتا اور مزے لیتا ہے۔

انگلستان کے سفر کو ختم کرکے آپ یورپ آئے۔ فرانس، بلجیم، جرمنی اور اٹلی کے مشہور مقامات اور خصوصاً وہاں کی تعلیم گاہوں کو دیکھتے ہوئے آپ مصر تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی خاص طور پر پزیرائی ہوئی۔ مصر کے پاشاؤں کے مشہور کلب کے آپ اعزازی ممبر بنائے گئے۔ قاہرہ میں مرحوم زغلول پاشا سے اور آپ سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ مصر میں ڈیڑھ ماہ قیام کے بعد آپ انگورہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کلب میں اتارے گئے۔ اور قوم (ترک) کے مہمان بنائے گئے۔ غازی مصطفےٰ کمال صدر جمہوریۂ ترک سے ربط و ضبط رہا۔ اور ترکوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرکے آپ ہندوستان تشریف لے آئے۔ مصر کے مشہور روزانہ اخبار الاہرام نے اپنے پرچہ میں آپ کے حالات اور خیالات درج کیئے۔ اس کا ترجمہ اس ملک کے اخبارات نے بھی شایع کیا اور وہ بہ دلچسپی پڑھا گیا۔

اس سفر سے واپسی کے بعد آپ کا گو برابر قیام کلکتہ ہی میں رہا اور آپ ہمیشہ علمی و ادبی مشاغل میں بہ دستور سرگرم دکھائی دیئے۔ مگر سنہ ۱۹۲۲ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ اس

صدمہ نے آپ کو عرصہ تک علیل و معطل رکھا۔ ۱۹۲۵ء میں کلکتہ کے سے مشرقی اُفق سے "آفتاب" نام ایک ماہوار رسالہ نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر جناب چراغ حسن حسرت صاحب کی خاطر سے آپ کو پھر قلم ہاتھ میں لینا پڑا۔ اس رسالہ میں متعدد مضامین، جناب ادیب الملک نے اپنے اور فرضی ناموں سے تحریر فرمائے۔ پھر ڈھاکہ کے مشہور رسالہ میں تزکِ خیال (خود نوشت سوانح) کے نام سے عرصہ تک ایک سلسلۂ مضامین شایع ہوتا رہا۔ وہ رسالہ ۱۹۲۸ء میں کیا بند ہوا کہ ہم اپنے ادیب کے قلم سے محروم ہو گئے۔

طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ۱۹۲۹ء میں آپ کو کلکتہ چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ۔ علی گڈھ۔ دہلی اور لاہور و سندھ اور کشمیر میں آپ کا زیادہ قیام رہا۔ ۱۹۳۱ء کے اخیر میں جبکہ آپ علی گڈھ تشریف رکھتے تھے وہاں کی مشہور انجمن یونین کی فرمائش پر آپ نے ایک سیر مضمون "ہماری شاعری" تحریر فرمایا۔ یہ نادر و بائع مضمون دہلی کے مشہور و معروف رسالہ جامعہ میں (جنوری ۱۹۳۲ء) شایع ہو گیا ہے۔ یوں تو ہمارے ادیب الملک کا وہ کون سا ایسا مضمون ہے جو نادر نہ سمجھا گیا ہو۔ مگر یہ مضمون ایک زبردست مطالعہ اور ۳۰۔۳۵ برس کی مشق کا نتیجہ ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا چھوٹا منھ اور بڑی بات ہے۔ اُسے جس نے پڑھا وہی اُس کا لطف اٹھا سکتا اور جو اسے مطالعہ کرے وہی اُس کا مزا لے سکتا ہے۔ اس ایک مضمون میں آپ نے دنیا کے ادب، تاریخ، اخلاق، مذہب اور سیاست اور پھر زبان و شاعری کو اس طرح یکجا کر دیا اور اس سے وہ نتیجہ نکالا ہے جسے صرف ایک فلسفیانہ و حکیمانہ دماغ ہی بتا اور دکھا سکتا ہے۔

ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ کئی سال بعد پھر کلکتہ تشریف لائے۔ اور شروع ۱۹۳۳ء سے آپ کا قیام اپنے قدیم شہر کلکتہ میں ہے۔ اور یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہماری دیرینہ نیازمندی پر نظر کر کے آپ نے مجھے اپنی بیش بہا تصنیف داستان اردو کا ایک باب "مغل اور اردو" شایع کرنے کے لیئے مرحمت فرمایا۔ اور وہ اب ہدیہ دوستاں ہوتا ہے۔

شروع میں میں نے اپنے ممدوح کے خاندان کا مختصر حال درج کر دیا ہے۔ اب اس لحاظ سے کہ ہمارے شوقین ناظرین اپنے ادیب الملک کے جلیل القدر خانوادے سے بھی اچھی طرح واقف ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اردو اُن کے گھر سے بنی اور جس طرح خاندان انیس نے اودھ میں، دو سو سال اردو کی خدمت میں صرف کیئے، اسی طرح ہمارے ادیب الملک کے خاندان نے بھی بہار میں دو سو برس تک اس زبان کی پرورش کی۔ ہم اس وقت ممدوح کا وہ شجرۂ نسب بھی درج کرتے ہیں جو عرصہ ہوا رسالۂ جادو میں شایع ہو چکا ہے۔

اس خاندان میں ریاست و امارت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا بھی ہمیشہ شوق و ذوق رہا ہے۔ آپ کے دادھیال اور ننھیال کے جملہ بزرگوار ذی علم اور ادب و شاعری میں ممتاز اور اردو کے سرپرست تھے۔ آپ کی دادی صاحبہ کے والد ماجد نواب محمد عیسیٰ خاں، عیسیٰ تخلص کرتے اور فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ پھر آپ کی نانی صاحبہ کے پدر بزرگوار نواب مہدی علی خان مہدی بھی فارسی و اردو کے ماہر اور ان دونوں زبانوں میں نظم کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ ان نواب صاحب کے لیئق فرزند نواب جلال الدین حسین خان تاثیر جو شروع عہد انگلشیہ میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے، نہایت ذی علم اور باپ کے شاعر تھے۔ ہندوستان میں وہ پہلے بزرگوار ہیں جنھوں نے ۱۸۲۷ء عیسوی میں بحیثیت جج مقدمات کا فیصلہ اردو میں لکھنا شروع کیا، اور وہ نہایت مقبول ہوا۔ اسی طرح آپ کے ماموی محترم سید الشعرا جناب شاد علیہ الرحمہ اس ملک کے اُن برگزیدہ حضرات میں سے تھے جن کے ادب و شاعری کا زمانہ قائل رہا۔ غرض یہ وہ خاندان عالی ہے جس کے گھر میں اردو کی پرورش ہوئی۔ اور ہمارے ادیب الملک وہ بزرگوار ہیں جن کی زبان خاندانی اور ٹکسالی ہے۔ اُن کی زبان و قلم سے جو نکل جائے وہی محاورہ اور وہی وہ اردو ہے، ہندوستان جس کی تقلید کرتا ہے۔

نواب ادیب الملک کے خاندان کا مذہب ہمیشہ شیعہ رہا ہے۔ اور آپ بھی اسی مسلک کے پابند ہیں لیکن آپ کی شیعیت وہ شیعیت ہے جس میں ولائے اہلبیت کے ساتھ خواہ مخواہ کسی ذات سے ابرا و تبرا کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ جن خوش قسمت حضرات کو آپ سے لطف صحبت اٹھانے کا موقعہ ملا ہے وہ شاہد ہیں کہ فلسفہ و تاریخ و ادب کے ساتھ ساتھ آپ کے مذہبی معلومات بھی حیرت انگیز ہیں۔ آپ نے خود کو ہمیشہ 'شیعہ' کہا اور صحبتوں میں یہی ارشاد کیا ہے کہ جو مسلک ہمارا ہے یہی مسلک ہمارے خاندان کا ہمیشہ سے رہا اور ہم نے اسی آب و ہوا میں پرورش پائی اور اسلام کے موجودہ اختلافات سے ہمارا خانوادہ ہمیشہ دور و نفور رہا ہے!

آپ ملک کے اُن چیدہ حضرات میں سے ہیں جنھیں ہندوستان کا ہر کہ و مہ جانتا اور اُن کی عزت کرتا ہے۔ آپ کے احباب کا دائرہ اتنا وسیع ہے جس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ کلکتہ کی سوسائٹی میں آپ کا درجہ بلند اور ایک امتیاز رکھتا ہے۔ ہر فرقہ و ملت کے حضرات کے ساتھ آپ کا ربط و ضبط قائم اور اپنے احباب کے ساتھ آپ کا برتاؤ، عزیزانہ و بے تکلفانہ ہے۔ یہاں کا ہر چیز فہم آپ کی عزت کرتا اور آپ سے محبت رکھتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ خدا ہمارے ممدوح کو صحت و عافیت بخشے اور ان کے سایہ کو ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے کہ ہم ہمیشہ اُن کی ذات والا صفات سے مستفیض ہوتے رہیں اور آپ کی 'داستان اُردو' ملک میں ایک عرصہ سے جس کا شہرا ہے، مکمل ہو کر جلد سے جلد شایع ہو جائے کہ ہماری اردو کا اور نام بلند ہو اور اس کی آواز دور دور پہونچے۔

ہم اخیر میں اپنے عزیز پُر تمیز سید امیر نواب سلمہٗ کی صحت و عافیت کی بھی دعا کرتے ہیں کہ ہمارے ادیب الملک کے باغ تمنا کا اب یہی ایک اکیلا گُل نارس ہے اُس کا پھولنا پھلنا اور اس کی شادابی کا دیکھنا خدا انھیں نصیب کرے۔

شائق احمد عثمانی

کلکتہ۔ مئی ۱۹۳۳ء

نسب نامۂ آفتاب الملک

(از [illegible] آباد، ڈھاکہ سنہ ۱۹۲۹ء)

(۱)

(۱) حضرت محمد رسول اللہ صلعم (۲) حضرت فاطمہ زہرا (۳) حضرت امام حسین علیہ السلام (۴) حضرت امام زین العابدین (۵) حضرت عبداللہ باہر (۶) محمد ارقط (۷) محمد اسمٰعیل (۸) محمد یحییٰ (والئ گیلان) (۹) علی (۱۰) عبداللہ (۱۱) حسین فیروزی شاہ شیراز (۱۲) میر بزرگ (۱۳) کبیر المشائخ والئ شیراز (۱۴) عظمت الٰہی (۱۵) محمد عادل (۱۶) سید میر ہاشم (۱۷) عبداللہ علی (۱۸) محمد نور ہندآمد دختر خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی را بعقد گرفتند (۱۹) سید دانشمند خان دانش زوج ہمشیرہ صمصام الدولہ نواب خان دوران خان بہادر (۲۰) میر رستم علی عقیل ہمشیرزادہ امیر الامرا که از دہلی بعظیم آباد آمدہ، روشن الدولہ صوبہ دار پٹنہ را معزول ساختہ بہار را بہ بنگال ملحق کرد (۲۱) سید مردان علی فرزانہ صوبہ دار پورنیہ (۲۲) سید حیدر علی حیدر (۲۳) سید قمبر علی قمبر (۲۴) سید تفضل علی تفضل حاکم کڑا مانک پور، الہ آباد

(۲۵) سید محمد محسن محسن — سید محمد عباس عباس

(۲۶) سید جعفر حسین جعفر — سید نوروز حسین

سید صادق حسین نہال — سیدہ بیگم — خیال

سید الشعرا خان بہادر شاد — سید النسا بیگم (زوجہ سید نوروز حسین)

سید حسین — خیال

(۲) سادات بارہہ اولاد زید بن علی ابن الحسین علیہ السلام

(۱) نواب میر سید زین الدین علی خان عرف میر زینا برادر امیر الامرا نواب سید حسین علی خان مشہور بہ شاہ نشان (۲) نواب سید نصیر الدین علی خان بہادر (۳) نواب سید اولاد علی خان بہادر (۴) نواب سید صفدر علی خان صفدر (۵) نواب صاحب بیگم زوجہ سید تفضل علی

(۶) سید محمد محسن محسن — سید محمد عباس عباس

سید جعفر حسین جعفر — سید نوروز حسین

سید صادق حسین نہال — سیدہ بیگم

خیال

[illegible]

خیال

(۳) سادات بارہہ

(۱) نواب میر سید زین الدین علی خان عرف میر زینا برادر امیر الامرا (۲) نواب سید نصیر الدین علی خان (۳) نواب سید اولاد علی خان (۴) نواب سید صفدر علی خان صفدر (۵) نواب الٰہی بیگم (زوجہ نواب محمد عیسیٰ خان)

(۶) نواب فاطمہ بیگم (زوجہ سید محمد محسن محسن)

سید جعفر حسین جعفر — سید نوروز حسین

سید صادق حسین نہال — سیدہ بیگم — خیال

(۴) سلسلہ ابو ایوب انصاری

نواب خواجہ عبدالرزاق خان بہادر گڑھ توڑ نو سلطان محمد امیر شیخ اسحاق شاہ فارس خواجہ حافظ گفتہ است

خداوندگان سلاطین مشرق و مغرب خدیو کشور عفو و کرم بہ استحقاق سپہر علم و ضیا آفتاب جاہ و جلال جمال دنیا و دین شاہ ابو اسحٰق۔ نواب خواجہ از امرائے شاہجہاں بودند۔ گڑھ توڑ خطاب یافتند و بہ صوبہ داری اردل و گورکھپور مقرر گشتند۔

سلسلہ ابوایوب انصاری

(۲) نواب شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق بہادر نیکنام عالمگیری آتالیق شاہزادگان معظم و اعظم۔ و وزیر محمد شاہ بادشاہ (۳) نواب یمین الدولہ عنایت خان راسخ احمد شاہی مصنف عنایت نامہ (۴) نواب محمد حفیظ اللہ خان حفیظ (۵) نواب حسینی بیگم زوجۂ نواب جعفر علی خان جعفر نوہ خان صادق کہ

از دہلی و پانی پت بہ عظیم آباد آمدند

نواب مہدی علی خان مہدی (زوج نواب نور النساء بیگم)

نواب جلال الدین خان تاثیر — نواب عارفہ بیگم زوجہ سید محمد عباس

چھوٹی بی (زوجہ ...) پہلے بیٹی پیدا ہوئی اردو میں فیصل لکھنا شروع کیا — سید الشعراء شاد — سید امیر حسین ایجاد — سید النساء بیگم (زوجہ پیر ...)

سید حسین — زہرا بیگم — نہال — خیال

سلسلہ ابوایوب انصاری

(۱) نواب خواجہ عبدالرزاق گرھتوڑ شاہجہانی

(۲) نواب شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق

(۳) نواب محمد عزت اللہ خان عزت پسر دوم خان صادق

(۴) نواب محمد جعفر علیخان جعفر (زوج گھسینی بیگم) — نواب محمد باقر علی خان

از دہلی بہ پٹنہ آمدند — نواب محمد امان اللہ خان

(۵) نواب مہدی علیخان مہدی (زوج نواب نور النساء بیگم) — نواب زادگان پانی پت

نواب جلال الدین خان تاثیر — نواب عارفہ بیگم (زوجہ محمد عباس)

سید الشعراء شاد — سید امیر حسین ایجاد — سید النساء بیگم

سید حسین — زہرا بیگم — سیدہ بیگم — نہال — خیال

سلسلۂ خاندان ترک افشار، فرقۂ اتراک استلنجو، سلاطین ترکستان بودند۔

(۱) نواب بہرام خان رزیر شاہ عباس صفوی (۲) نواب محمد ابراہیم خان ابراہیم۔ بہ ہند آمدہ ہمشیرہ ابوالحسن تانا شاہ والیٔ دکن را بہ عقد گرفتند (۳) نواب علی جواد خان جواد داماد نواب مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ۔ (۴) نواب اسمٰعیل قلی خان اسمٰعیل صوبہ دار مونگیر در زمانۂ مہابت جنگ۔

(۵) نواب محمد حسین خان احمد کمانڈر افواج بنگالہ۔

(۶) نواب محمد ابراہیم خان ابراہیم صاحب منتخب الانشاء۔

(۷) نواب نور النساء بیگم۔ صاحب طبقات علی وردی خانی و زوجۂ نواب مہدی علیخان

نواب عارفہ بیگم (زوجۂ سید محمد عباس)

سید الشعراء شاد — سید امیر حسین ایجاد — سید النساء بیگم

سید حسین خان — زہرا بیگم — نہال — خیال — سیدہ بیگم

سلسلہ ابوایوب انصاری

(۱) نواب خواجہ عبدالرزاق (۲) نواب لطف اللہ خان صادق (۳) نواب محمد صادق مصنف گلشن صادق (۴) نواب محمد امتیاز خان (۵) نواب محمد علیخان — نواب یحییٰ خان — نواب عیسیٰ خان عیسیٰ — امتیاز زوجہ — سید محسن حسین

(۶) نواب فاطمہ بیگم — سید جعفر حسین خان جعفر — سید نور حسین خان — سیدہ بیگم — سید صادق حسین نہال

خیال

"مقدمہ"

بہ نام خدائے زباں آفریں!

۱۹۱۵ء کے دسمبر میں کانگریس و مسلم لیگ کے سالانہ جلسے بمبئی میں ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ اپنے ملکی و قومی مطالبات و خواہشات کا ایک مقام پر اس طرح اظہار کیا ہو۔ اس نادر موقعہ پر نظر کر کے ہندو مسلم سمجھوتے کی غرض سے وہاں چند مقتدر اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی گئی کہ وہ ان دونوں قوموں کے درمیان ایک قطعی و دائمی فیصلہ کرادے۔ اس کمیٹی کے ہمارے مخدوم و محترم ادیب الملک نواب خیال بھی ایک رکن تھے۔ مگر جناب ممدوح اُس وقت بمبئی میں تشریف نہیں رکھتے تھے اس کمیٹی اور اپنے انتخاب کی اُنھیں بعد کو خبر ہوئی۔

۱۹۱۶ء کے جون میں اس کمیٹی کی پہلی نشست کلکتہ میں قرار پائی۔ اجلاس کا اجنڈا نواب صاحب موصوف کو ملا تو اُنھیں حیرت ہوئی کہ اس کے پروگرام اور کام میں زبان کا مسئلہ شامل نہیں ہے۔ انھوں نے فوراً کمیٹی کے سکتری سرندرو (سر سرندر ناتھ بنرجی) بابو کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحریر کیا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جب تک زبان کا تصفیہ نہ ہو جائے کہ اس ملک میں آئندہ کون سی ایسی زبان دائر و سائر ہو جو ان دونوں کے لیئے قابل قبول ہو کر سرکاری طور پر بھی وہ رائج اور تسلیم کی جاسکے ان کے درمیان کوئی حقیقی اور پائدار فیصلہ نہیں ہو سکتا"!

سر سرندرو نے ہمارے ممدوح کی اس رائے کو غائر اور وقعت کی نظر سے دیکھا۔ مگر پروگرام اور کمیٹی کے اجنڈا میں اُس وقت کسی تبدیلی کو وہ اپنے اختیار سے باہر سمجھے کیونکہ اس کی ترتیب بہت قبل بمبئی میں کانگریس و مسلم لیگ کے مشورہ سے ہو چکی اور اب اُس میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس مسئلہ (زبان) کے متعلق سرندرو بابو اور نواب صاحب سے مراسلات جاری رہے۔ اور جبکہ یہ واضح ہو گیا کہ زبان کا مسئلہ اس کمیٹی کے پروگرام میں داخل نہیں کیا جاسکتا تو ممدوح اس کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔

یہ مراسلات (درمیان سر سرندرو اور نواب صاحب) بنگالی اخبار اور ملک کے دیگر جریدوں میں اُسی وقت شایع ہو گئے۔ اور جب سے زبان کے مسئلہ پر غور و فکر ہونے لگی۔ اسی سال (۱۹۱۶ء) کے اگست میں ایک آل انڈیا اردو کانفرنس کے قیام کی تجویز ہوئی اور ملک کے ہندو مسلم اکابرین نے

اس کانفرنس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کرنا اس خیال سے قرار دیا کہ وہاں اُس سال بھی کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ساتھ انعقاد پانے والے تھے۔

اس تجویز کی تکمیل کے بعد ملک نے ہمارے ممدوح نواب صاحب پر فرمائش کی کہ وہ اس اہم و تاریخی جلسہ کی صدارت فرمائیں یہ گزارش مقبول ہوئی۔ آل انڈیا اردو کانفرنس کا یہ پہلا جلسہ ۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ کے قیصر باغ کی مشہور و معروف بارہ دری میں منعقد ہوا۔ تقریباً آٹھ ہزار کا مجمع تھا۔ ہندو اکابر بارہ دری کی شہ نشین پر جلوہ گر تھے۔ گاندھی جی، سرندرناتھ، موتی لال نہرو، مسٹر تلک، اور پنڈت مدن موہن مالوی جی کے سے ممتاز حضرات کے ساتھ مسلمانوں کے رہبروں میں مرحوم مہاراجہ محمود آباد، مسٹر محمد علی جناح اور مسٹر جسٹس وزیر حسن کے سے مشخص اصحاب بھی نمایاں نظر آتے تھے۔

اس موقعہ خاص کے لیئے ہمارے ادیب الملک نے ایک خطبہ تحریر فرمایا تھا جو اُس وقت ایک شان کے ساتھ ابلاغ کیا گیا۔ اس کی تمہید کے یہ فصیحانہ و باموقعہ فقرات دلوں میں گھر کر رہے ہے اور حاضرین کو تڑپا رہے تھے۔

" میں واقعی تہ دل سے اپنی اس عزت افزائی پر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اتنی بڑی "
" مجلس کا جہاں سارے ہند کے منتخب و چیدہ حضرات، بلا افتراق مذہب و ملت اپنے ایک مقصد کے "
" انجام کی خاطر ایک ہی پلیٹ فارم پر آج نظر آتے اور اس سے اپنی قومیت کا ثبوت دے رہے ہیں "
" مجھ سے شخص کو آپ نے صدر منتخب کیا اور اپنے اس مقصد کے متعلق میرے خیالات سننے "
" کی بھی مجھ پر فرمائش کی۔ حق یوں ہے کہ آج کا جلسہ اور اس کی صدارت معمولی نہیں۔ "
" ہندوؤں کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ یہاں کی یہ دو جماعتیں (ہندو و مسلمان) کسی ایک "
" مقام پر یوں ہنسی خوشی ساتھ کھڑی دکھائی دیں۔ اور ان دونوں میں اس طرح کی ملت "
" اور یک سوئی نظر آئی! اور خوش قسمت ہے وہ جس نے ایک ہی جلسہ میں اُن کو ساتھ "
" مخاطب کیا۔ اور بڑا خوش نصیب ہے وہ جسے بے مانگے ایسی نعمت حاصل ہو گئی!! "

پھر دوران تقریر میں جس وقت آپ نے کہا کہ:۔

" آج کے عظیم الشان اور ایسے یادگار جلسہ کی صدارت کے لیئے مجھ پر فرمائش ہوئی تو میں "
" ناسازی مزاج کے باعث اس شرف کو قبول کرنے میں پس و پیش کر رہا اور اپنی حالت "
" کو سوچ رہا تھا کہ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ یہ وہ موقعہ ہے جہاں اس زمین کی بہترین پیداوار "

"اور ہماری بھرت ماتا کی نادر یادگار اردو کی خدمت ہمارے سپرد ہوگی۔ تو پھر اپنی موجودہ"
"حالت کو فراموش کر کے میں ایسی خدمت کو اصل مادر وطن کی خدمت سمجھا اور آج کی"
"حاضری کو فرض خیال کر کے لبیک کہتا ہوا، اٹھ کھڑا ہوا"!

تو جلسہ منقلب نظر آنے لگا۔ زبان کے مسئلہ کے متعلق آپ کے منھ سے یہ گرم و چسپت الفاظ نکلے تو مجلس میں ایک بجلی سی کوندی اور اہل مجلس بے چین ہو گئے۔

"زبان کا مسئلہ ہر ملک و قوم میں جملہ مسائل پر مقدم سمجھا گیا ہے لیکن ہماری زبان کو اس ملک"
"میں وہ بزرگی و اہمیت حاصل ہے جس کے سلجھے یا سلجھائے بغیر ہماری ہر بازی ابتر"
"ہے۔ اور یہی وہ ترپ ہے جس کا ہاتھ آجانا کسی سلطنت کے جیت لینے کے برابر ہے"!

اس جلسہ میں ہماری عورتیں بھی چلمن ڈالے شریک تھیں۔

فاضل صدر نے انھیں دفعتہً یوں مخاطب کیا:۔

"مجھے جہاں آپ حضرات کو آج مخاطب کرنے کا شرف و انبساط حاصل ہوا وہاں اتنا"
"تعلق ضرور ہے کہ اس زبان کو جن کی ذات سے بہت زیادہ تعلق رہا اور آج جن کی"
"بدولت اردو اردو بنی اور جن کی زبان اب تک ٹکسالی سمجھی جاتی ہے۔ ہماری موجودہ"
"سوسائیٹی کی غلط کاریوں نے انھیں اس طرح گھر بٹھایا اور ہم سے اتنا دور کر رکھا ہے کہ ہماری آواز"
"تک اُن کے لیئے نامحرم بن گئی ہے! یہ ہماری عورتیں ہی ہیں جنھوں نے بیرونی اثرات سے"
"اس زبان کو اب تک محفوظ رکھا اور یہ ہماری عورتیں ہی ہیں جنھیں اپنی اردو پر ہم سے بہت"
"زیادہ حق حاصل ہے۔ اس زبان کی حکایت سننے کی وہ ہم سے بڑھ کر مستحق اور سزاوار ہیں"
"مگر افسوس کہ ہماری آواز بے تکلف اُن تک پہونچ نہیں سکتی۔ اور افسوس کہ وہ اس مجمع"
"میں اپنی آواز ہم تک پہونچا نہیں سکتیں"!

صدر کے یہ الفاظ عورتوں میں ایک جوش ڈال رہے تھے۔ وہ اپنی پست حالت کو سوچ رہی اور اس طرح کی ناجائز قید پر غصہ و غم ظاہر ہی اور اردو کے ذکر میں اپنی زبان کے نہ کھلنے کا ماتم کر رہی تھیں!۔

وہ زمانہ دنیا کی عالمگیر جنگ کا تھا۔ فاضل صدر نے اس جنگ کا اپنی تقریر میں یوں ذکر فرمایا۔

"موجودہ جنگ، مختلف قوموں اور مختلف زبانوں کی جنگ ہے۔ اور بر اعظم یورپ میں"
"آج اگر کوئی ایک ہی زبان رائج اور دائر و سائر ہوتی تو تخیلات اس درجہ پراگندہ و پاشاں"

"نہ ہوجاتے اور پھر مقاصد جو تخیلات کے تابع ہیں اس طرح مختلف نہ ہوتے کہ ایسی ہولناک
"جنگ یوں برپا ہو کر ایک عرصہ تک قائم رہ جاتی"!
"اس جنگ سے ہمیں فطرۃً واسطہ اور ہمارے لیئے وہ بڑی سبق آموز ہے ہمارے بہادر"
"بلا کسی شرط کے اس لڑائی میں شریک ہوئے اور اپنے شہنشاہ کے نام پر فدا ہوتے چلے گئے،
"شکر کہ ہم سرخ رو اور وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ ان بہادروں میں سے نوے"
"فیصدی اسی زبان اور ہماری اردو کے بولنے اور سمجھنے والے تھے۔ اُن کے الفاظ، یورپ کے"
"گاؤں گاؤں میں پھیلے اور اُن کے خون کے ساتھ وہاں کی زمین پر اپنا گہرا نقش بٹھا چکے ہیں"
"یورپ بھی اب ہماری قلمرو سے باہر نہیں۔ وہاں کے جریدوں پر بھی اس زبان کے حروف ثبت"
"ہوئے اور ایک دوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ مسافر وفاداری کا نام زندہ کر کے اور اپنی"
"اُردو کو اخیر منزل تک پہنچا کر آسودہ ہوئے! بیرا آئرن کی پیتا اور ووکنگ کے ہر واڑ"
"میں آج وہ بے خبر سو رہے ہیں۔ آؤ اُن کے کارناموں کو سراہیں اور جس طرح انھوں نے"
"ہمیں عزت بخشی اور اپنی زبان کا بول بالا کیا ہم بھی اس وقت کھڑے ہو کر ان کے شکریہ و"
"دعا کے لیئے ہاتھ اٹھائیں اور اپنا فرض ادا کریں"!

اِن فقرات کے ختم ہوتے ہی حاضرین جلسہ بے اختیار اُٹھ کھڑے ہو گئے اور بہ جوش و خروش اپنے شہید مسافروں اور اردو کا نام لبند کرنے والوں کے لیئے فاتحہ پڑھنے لگے۔

حاضرین بیٹھ لیئے تو پھر تقریر چھڑی اور زبان سے بے پرواہی کا گلہ یوں شروع ہوا۔
"موجودہ تعلیم کے نقائص میں سے بڑا نقص اپنی ذات سے منحرف اور لاپرواہ ہو جانا شمار کیا جاتا ہے"
"یہ بدیہات اور مشاہدات میں سے ہے اس تعلیم کی چھری ہماری زبان کے گلے پر بھی پھری جو"
"زبان خلیج فارس سے خلیج بنگالہ تک اور پھر ہمالہ کی چوٹیوں سے راس کماری کے میدانوں اور"
"سمندروں تک قبضہ کیئے ہوئے اور اس جزیرہ نما (ہند) کو چار طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور"
"جس کے قلمرو سے یہاں کا کوئی چپہ باہر نہ ہو اور یہاں کے مختلف سکوں پر بھی جس کی ضرب"
"پڑی ہوئی ہو اُس سے بے پرواہ ہو جانا بدنصیبی اور خود اپنی شامت ہے"!

الفاظ دلوں کو سیراب اور اردو کے وزن و اثر کو بڑھا رہے تھے۔ جلسہ ہمہ تن متوجہ تھا کہ دفعتہً سر جیمس مسٹن (لارڈ مسٹن گورنر یوپی) تشریف لے آئے۔ اُن کی پذیرائی کے بعد اپنے موقعہ کا لحاظ کر کے

گورنمنٹ اور ہماری زبان کے متعلق اس طرح حاضرین کو مخاطب فرمایا۔

"اس گورنمنٹ کے برکات اور اس کی عنایات میں سے بڑی عنایت اس زبان کی سرپرستی
"تھی جس کا مفصل ذکر آگے آپ سننے والے ہیں لیکن اب اس سے جس طرح کی مغائرت اور علٰحدگی
"برتی جاتی اور اس وجہ سے حاکم و محکوم کی جیسی دوری بڑھتی جاتی ہے، اس کی ہمیں بڑی شکایت
"ہے! آپ کو اس ملک کا تجربہ، یہاں کی تاریخ اور ہمارا آئندہ بیان بتائے گا کہ اس زمین
"کی آب و ہوا کسی بیرونی زبان کو پھولنے پھلنے نہیں دیتی۔ گذشتہ تجربوں سے سبق لینے کی
"ضرورت ہے۔ خلاف فطرت امر چل نہیں سکتا۔ اور ۳۵ کروڑ مخلوق کوئی غیر زبان اختیار
"نہیں کرسکتی۔ اب اس پر غور کرنے اور زبان و تعلیمی پالسی پر نظر ثانی کا وقت آگیا ہے"۔
"انگریزوں کے قدم یہاں اسی زبان (اردو) کے علم نے جمائے۔ ہمارا ان کا رشتہ بندھ چکا،
"ہمارے نیک و بد کا اثر ان پر اور ان کے نیک و بد کا اثر ہم پر پڑتا ہے اور پڑتا رہے گا۔
"ملکی زبان جاننے کی ضرورت ڈیڑھ سو برس بعد بھی فوت نہ ہوئی۔ اور ہزار سال بعد بھی فوت
"نہ ہوگی۔ جو حکام ہماری زبان جانتے تھے انھیں اس ملک نے بہ شکرگذاری یاد رکھا ہے،
"اور جو اب بھی ہمارے ادب سے واقف ہو کر ہماری معاشرت و تہذیب کو سمجھ چکے ہیں وہ اپنے
"مقاموں پر ہمیشہ ممتاز نظر آئے ہیں۔ مرحوم سر جان اوڈ برن (گورنر بنگال) اسی اُردو دانی
"کی بدولت ہر دل عزیز و کامیاب نظر آئے۔ اور آج بھی سر جیمس مسٹن، نہیں نہیں، ہمارے
"مِسْتَن صاحب ہماری زبان جاننے کی وجہ سے ہمارے سرتاج ہو رہے ہے اور یہاں وہ اپنے
"خاندانی نام سے نہیں بلکہ ہمارے مذاق کے مطابق مِستن صاحب کے پیارے اور بے تکلف
"نام سے پکارے جا رہے اور ہمارے دلوں میں گھر کر رہے ہیں"!

یہ سچے اور برجستہ فقرے نہ صرف عام حاضرین جلسہ ہی کو ہمہ تن گوش کیئے ہوئے تھے بلکہ لارڈ مسٹن بھی اُن سے متاثر نظر آئے۔ اور تقریر کے ختم ہونے پر اُنھوں نے ہمارے فاضل مقرر (صدر) کا تعریفوں کے ساتھ بیحد شکریہ ادا کیا۔

اس تمہید کا اخیر حصہ بھی لاجواب تھا۔ نتیجہ کلام ان الفاظ پر ختم کیا گیا۔

"ایک دو صدی نہیں بلکہ آپ کی زبان کا پوری چالیس صدیوں کا قصہ اور اس کی تدریجی
"ترقی کا حال ابھی چند منٹ میں آپ کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ اور اسے سن کر اپنی

"تعلیم اور اپنی سیاسیات پر بھی غور کرنے کا آپ کو موقعہ ملے گا۔ جو زبان سلطنت کی زبان،
"نہ ہو اور کسی قوم کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہ کر سکتی ہو اُس کی بزرگی و اہمیت دیرپا نہیں ہو سکتی"!
"چار ہزار برس کی محنت اور ہزار سال کی متفقہ کوشش کے بعد اس اردو کو پراکرت کے معمولی،
"درجہ سے ترقی دیکر زبان یعنی لینگوایج کے رتبہ تک لا چکے ہیں۔ اور اب آپ کا فرض ہے کہ،
"جہاں تک جلد ممکن ہو اپنی زبان کو نئی اور موجودہ ضروریات کے مطابق بھی بنا ڈالیے۔،
"مشاعروں کی واہ واہ اور مجلسوں کی آہ آہ سے اب ہمارا کام چل نہیں سکتا۔ اوس سے پیاس،
"نہیں بجھ سکتی ہم کو کچھ اور کرنا اور اس زبان کو کچھ اور بنانا ہے!" اپنے اصل مقصد کو ہمیں ہمیشہ،
"پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ہمارا وہ مقصد کیا ہے؟ ہمارا نقطۂ نظر ہندیوں کو ان کی مادری زبان،
"میں تعلیم دینا اور ایک ایسی اردو یونیورسٹی کا قائم کرنا ہے۔ جس کی تحریک آج سے پچاس،
"برس قبل یعنی سنہ ۱۸۶۷ء میں علی گڈھ سینٹیفک سوسائٹی اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی،
"متفقہ کوشش سے عام ہو چکی اور گورنمنٹ تک جس کی عرضداشت جا چکی تھی! اور جس کا،
"مفصل حال آپ ہماری اس تقریر کے اخیر حصہ میں ابھی سن لیں گے"۔

"صاحبو۔ ان کوششوں کے ساتھ ہمارا دوسرا فرض یہ ہے کہ اس زبان کی بنیاد جس زمین پر،
"قائم کی گئی اُس پر بدستور آپ کا قبضہ باقی رہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اُردو، بھاشا کی،
"ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور جب تک اس بھاشا کا درپن ہمارے سامنے نہ ہو اُردو کی ٹھیک،
"صورت ہم کو نظر نہیں آسکتی"!

"ہمارے فرائض میں سے تیسرا اہم فرض یہ ہے کہ اس زبان کے ذریعہ سے اس ملک کا اصلی،
"وصحیح کیرکٹر دنیا کے سامنے پیش ہوتا رہے۔ ہمارے ہیروز زندہ کیئے جائیں اور اُن کی،
"لائق پرستش تصویر ہر وقت ہمارے پیش نظر رہے"۔

"صاحبو! کارنامۂ انیس اور رامائن کا فسانۂ نفیس ہماری ہر طرح کی تعلیم اور ذہنی،
"ودماغی ترقی کا وہ آلۂ عجیب ہے جو کسی ملک میں بہ آسانی نصیب نہیں ہو سکتا۔ ہمارا کیرکٹر،
"اسکروائلڈ اور برنارڈ شا کی اسٹڈیز (مطالعہ گاہ) میں جا کر نہیں بلکہ انیس و تلسی داس کے،
"پرلے کتب خانوں کی سیر سے درست ہو سکتا ہے۔ ہمارا فرض اور بڑا فرض ہے کہ ان دونوں گوہر،
"نایاب کو نئے رنگ ڈھنگ سے سجا کر دنیا کے آگے پیش کریں اور اس طرح اپنی تہذیب کو آئینہ کر دیں"!

یہ فصیح و بلیغ تمہید ختم ہوئی۔ حاضرین پر ایک وجد طاری تھا۔ کچھ تامل کے بعد آپ نے اُردو کا قصّہ چھیڑا۔ اِس کی ابتدا و انتہا بیان کی۔ یہ تقریر بھی دو گھنٹے جاری رہی۔ محویت میں کسی کو یہ بھی محسوس نہ ہو سکا کہ اتنا وقت کیونکر گذر گیا ؟!

یہ تقریر ایک معرکۃ الآرا تقریر تھی جس کی نسبت حق کہا گیا کہ "کسی پلیٹ فارم پر آج تک ایسی اسپیچ سنی نہ گئی"! یہ اسی تقریر کا اثر تھا کہ حیدرآباد، اردو کی طرف یوں مخاطب ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء کے اخیر میں آپ نے ہندیوں کے نقطۂ نظر کی نسبت فرمایا تھا۔ کہ "ہمارا مقصد ہندیوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم دینا اور ایک ایسی اردو یونیورسٹی کا قائم کرنا ہے جس کی تحریک آج سے پچاس سال قبل ہو چکی اور گورنمنٹ تک جس کی عرضداشت جا چکی ہے"۔ ۱۹۱۷ء کے شروع ہی میں اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ نے اس آرزو پر نظر کر کے عثمانیہ (اردو) یونیورسٹی کے قیام کا فرمان جاری فرما دیا۔

یہ وہی تقریر ہے جس نے ملک میں زبان کے مسئلہ کو تازہ کر دیا۔ یہ وہی اسپیچ ہے جس نے اُردو کی محبت دلوں میں بٹھادی۔ یہ وہی بیان ہے جس نے زبان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ، قوموں اور ملکوں کی تاریخ اور اِن کے ربط و اختلاط کو واضح کر دیا۔ یہ وہی خطبہ ہے جس نے ہمارے ذہن و دماغ کو جولاں کر دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سترہ سال کے گذرنے پر بھی اس کی یاد باقی اور اس کے پڑھنے اور سننے کی آرزو تازہ ہے اِس لحاظ سے ملک نے بار بار خواہش کی کہ اردو کا یہ لاجواب قصہ دہرایا جائے۔ ہمارے ادیب الملک پر بار ہا فرمائش ہوئی کہ وہ جناب اس پر نظرِ ثانی فرمادیں۔ مگر زمانہ ہمارے موافق نہ تھا یہ گذارش پذیرانہ ہو سکی آخر بعض خاص احباب کے اصرار پر حضرت اِدھر متوجہ ہوئے۔ وہ قصہ چھیڑا اور اب اُن کے زرافشاں قلم نے جو گلکاری کی اُس کا نام داستان اُردو رکھا گیا۔ اس داستان کے اکثر باب ملک کے ممتاز رسالوں میں شایع ہو چکے اور اہل ملک اُنھیں سر، آنکھوں پر جگہ دے چکے ہیں۔ یوں تو اس کا ہر باب دیدنی ہے۔ مگر مغل اور اُردو اس کا وہ حصہ ہے جسے ماسٹر پیس کہنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ یہ پوری داستان ہماری محفل کو رونق دے مناسب سمجھا گیا کہ اسے فوراً شایع کر دیا جائے تاکہ مشتاقوں کی پیاس ذرا بجھے اور پھر وہ جرعہ انھیں دیا جائے جس سے ان کی تشنگی دور ہو جائے۔

اب ہم بہ کمال فخر و مسرت اس ہدیہ (مغل اور اُردو) کو ملک کے سامنے پیش کر کے حسب ذیل عرض کرتے ہیں کہ شائقین اس کے ملاحظہ کے بعد اصل تحفہ کو ملاحظہ کریں۔

یہ بیان (مغل اور اُردو) ہمارے شاہانِ مغلیہ کے اُن احسانوں کو یاد دلاتا ہے جو اِس ملک میں بابر سے بہادر شاہ تک مسلسل طور پر جاری و ساری رہے۔ ہند کی تاریخ کا یہ ضروری باب ہے جسے بیشتر اہلِ قلم بھولے اور اس وجہ سے خاندان تیموریہ کی یا کم از کم عالمگیر کے بعد کے مرقع کی تصویریں بدنما یا دھندلی نظر آنے لگی تھیں۔ ادیب الملک کا احسان کہ انھوں نے اس عیب کو مٹایا اور تاریخی ثبوت کے روغن سے اُن تصاویر کو خوش نما و روشن کر دکھایا۔

اس باب میں نہ صرف تذکرہ نویسوں کی غلطیوں یا سہو ہی کو نشان دے دیا گیا ہے بلکہ انگریزی درسی تاریخوں کی چال کا حال بھی کھول دیا گیا ہے۔ آج تک ہم اپنے شعرا و ادبا کی مجلس میں اپنے بادشاہوں کی زیارت سے محروم رکھے گئے تھے۔ مگر ہمارے مخدوم نے انھیں اُس صفِ اول میں جگہ دی جو اُن کے شانِ شایاں تھی۔ حق ہے کہ شاہوں اور امیروں کی نظر توجہ سے عموماً شعرا و ادبا وقار حاصل کرتے چلے آئے اور ان کی اس وجاہت سے زبانوں نے ترقی کی ہے۔ اس لیئے وہ اس نتیجہ کے سبب اول ہیں۔ منطق کی یہ اہم فروگذاشت اب دور ہوگئی۔ اور ہم ادیب الملک کے مدلل قلم کے مرہون ہو گئے۔

اسی ایک باب میں ملاحظہ ہو کہ زبان کے مسئلہ اور اُردو کے قصے کے ساتھ ساتھ مذہب، اخلاق، تاریخ، ملک اور تاریخ ملت اور پھر فلسفہ و سیاست اس طرح دست و گریبان نظر آتے ہیں کہ اگر اس بیان کی ایک کڑی بھی نکل جائے تو زبان کا مسئلہ ادھورا رہ کر سمجھ میں نہ آئے۔ اگلوں نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اس لیئے وہ اس مسئلہ کے سمجھانے سے قاصر رہ گئے۔ مگر اب وہ واضح ہوگیا اور ہمارے ان ادیب کے تبحر نے ہم کو حیرت میں ڈال کر اُردو کے فلسفہ کو سلجھا دیا۔

اس بیان کا اول اور اہم نکتہ وہ ہند و مسلم اتحاد ہے جس پر داستانِ اُردو کی بنیاد رہی ہے۔ اردو کا ذکر سنتے اور پڑھتے چلے آئے ہیں۔ اس نتیجہ تک بھی دماغ پہونچے ہیں کہ یہ زبان ہند و مسلم ریاض کا ایک بہترین پھل ہے مگر اتنی وضاحت اور تاریخوں کی اس درجہ شہادتوں کے ساتھ اب تک یہ مسئلہ پیش نہ ہوا تھا۔ ایک اسی مغل اور اردو میں وہ بھی عید کے چاند کی طرح نمایاں ہوگیا۔

ہمارے مغل بادشاہوں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ جو شاہانہ الطاف کیئے اور

پھر ان کی ممنون رعیت نے جس محبت و وفا سے کام لیا اس کا ثبوت بھی ہمارے ادیب الملک کے اس بیان سے بہتر کہیں اور یوں نہ ملے گا۔ اس ملک کی انگریزی اور خصوصاً درسی تاریخوں نے ہم کو بلا وجہ غلط طور پر بدنام کیا۔ اور ہندو مسلم فساد کا ایک حربہ ہاتھوں میں دے دیا ہے مگر اس بیان سے وہ حربہ بیکار ہو گیا۔ اس مغل اور اردو کے ناظرین سے ہم التماس کریں گے کہ وہ اکبر و شاہجہاں کے ذکر کے ساتھ ساتھ عالمگیر کا حال بھی بہ غور پڑھیں۔ اور پھر شاہ عالم کی منھ بولی بہن رام کور کا ذکر خیر اور بعد کو اکبر ثانی کے راجہ رام موہن کا حال بھی ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ نیک دل بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ کیا کرتے اور وفادار رعایا اپنے ولی نعمت کے ساتھ کیا کرتی ہے۔

اس ملک کی تاریخ تعلیم اور اس کے نتائج بھی اس بیان سے معلوم ہو گئے۔ یہ چیز بھی نئی اور ہمارے دماغوں تک اس طرح پہونچی اور پہونچائی نہ گئی تھی۔ انگریزی کی بلا وجہ شدت اور محض ڈگریوں پر ہماری فضیلت ملک کے موجودہ عذابوں میں سے ایک بڑا عذاب ہے۔ یہ تعلیم ہماری قومیت کو مٹانے والی اور ہم کو ایک دوسری قوم بنا دینے والی ہے۔ اس عذاب کو گو اب سمجھا جا رہا ہے مگر اس کے سبب اور کُنہ کو ہمارے ادیب الملک کے قلم کے سوا دوسرا یوں واضح نہ کر سکا۔

ہمارے مخدوم گو انگریزی تعلیم کے حامیوں میں سے ہیں۔ مگر وہ موجودہ طریقۂ تعلیم اور ہماری یونیورسٹیوں کی رفتار کو ملک و قوم کے حق میں سمِ قاتل سمجھتے ہیں۔ جناب موصوف اپنی مادری زبان میں تعلیم کے سوا کسی غیر زبان میں تعلیم کو تضیعِ اوقات ہی تصور نہیں کرتے بلکہ وہ اس طریقہ کو خلافِ فطرت سمجھتے ہیں۔

ہمارے ادیب الملک کا خیال ہے کہ اس ملک کے لیئے وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی تعلیم کے ساتھ مسئلہ زبان پر بھی غور و فکر کرے کہ اب اور آئندہ ہماری زبان کیا ہونا چاہیئے؟ اور نیز یہ کہ ہمارے ملک کی سیکڑوں زبانوں میں سے واقعی وہ کون سی ایسی زبان ہے جو یہاں راشٹر بھاشا کا لقب پانے کی مستحق ہو سکتی اور آئندہ انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے؟ ان زبانوں میں اردو کو ہر طرح ترجیح ہے اور وہ ہندوستانی کا صحیح خطاب پانے کی اہل اور حقدار ہے۔ اس اردو کو ہند کی اور زبانوں پر سروری کے حسب ذیل وجوہ ہیں۔

(۱) "یہاں کی مُردہ و زندہ زبانوں میں اب یہی ایک ایسی زبان ہے جو شمال ہند اور بہار کی مشرقی حد تک مقدس سانسکرت اور پیاری بھاشا کی قائم مقام و جانشین ہے، اور اسی طرح وہ پنجاب میں پنجابی کی سردار اور دکھن میں مہاراشٹری و دکھنی کی پیشوا ہے"۔

(۲) "یہ زبان غیر آریوں، آریوں، ہندوؤں، بودھوں، تاتاریوں، یونانیوں، عربوں، فارسیوں، اور ترکوں کے اس ملک میں میل جول کو یاد دلاتی اور ان کے اتحاد کو سراہتی اور پھر ہند کی گذشتہ تاریخ سنا کر ہم کو علم اللسان (فلالوجی) کا سبق پڑھاتی ہے"۔

(۳) "ہند میں یہی ایک زبان ایسی ہے کہ اس کا جاننے والا ملک کے ہر گوشہ میں گویا ہو سکتا اور اپنے روزمرہ کی ضروریات بہ آسانی پوری کر لے سکتا ہے"۔

(۴) "اس زبان کا بولنے والا ہند کی ہمسایہ قوموں اور ملکوں میں بھی گونگا اور بہرا نہیں رہ سکتا۔ افغانی، ترکی، فارسی اور عربی کی اتنی لفظیں اس میں شامل ہو گئیں، اور پھر دراویدی، ملائی، برمی، اور چینی الفاظ اس اردو میں یوں پھٹ گئے ہیں کہ ان غیر زبانوں سے وحشت کم ہو جاتی اور ذرا سے غور کے بعد وہ سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اور اس سے تمدن و معاشرت میں ترقی ہوتی اور تجارت میں بڑی مدد ملتی ہے"۔

(۵) "اس زبان میں وہ لچک اور وہ کشش و جذب موجود ہے کہ بھاشا کی طرح اسکی زندگی بھی غیر محدود ہے"۔

(۶) "اس زبان کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دیرینہ اتحاد کے قائم و دائم رہنے کے ساتھ ساتھ موجودہ حکمران قوم کے ساتھ بھی ربط و معاشرت ممکن ہے"۔

اگر ایمانداری سے غور کیا جائے تو اس زبان کے متعلق مذکورہ بالا وجوہ اس کی سربری و سرداری کے لیئے کافی و وافی نظر آئیں گے۔ اور صاحب نظر حضرات اسے بہت جلد اس درجہ تک پہونچانے کی فکر کریں گے کہ آئندہ وہ انگریزی کی بدیسی زبان کی جگہ لے کر اس ملک پر بہ آسانی حکمرانی کر سکے۔

میں اخیر میں اپنے ملک اور اہل ملک کو مخاطب کر کے اتنا اور اس وقت عرض کروں گا کہ اب

وہ وقت آگیا ہے کہ جلد سے جلد ہماری زبان کا مسئلہ طے کیا جائے ۔ یہ امر اب پوشیدہ نہیں کہ اس ملک کا ایک بڑا حصہ اُردو کا طرفداری نہیں بلکہ وہ اب اس زبان کی زندگی پر اپنی زندگی منحصر سمجھتا اور کسی حال میں وہ اس کے کھینچنے اور کچھ لانے کا روادار نہیں ۔ یہ زبردست گروہ ایران کی گذشتہ تاریخ سے واقف ہے کہ اس ملک نے اپنا مذہب تک دے دیا ۔ مگر اپنی زبان، جو انسان کا ایک شرف ہے کسی حال نہیں دی! ہم بھی اس پر ثابت قدم رہے اور ثابت قدم ہیں اور ثابت قدم رہیں گے اور اس زبان پر حرف نہ آنے دیں گے ۔ اردو کے عدو واقف رہیں اور اتنا سمجھ لیں کہ ؎

می پرد رنگم حبابے گر بہ دریا بشکند　　کئے تواند دید زاہد جام صہبا بشکند

ہم جب اس پر کسی حرف کا آنا گوارا نہیں کر سکتے تو اس کے مٹنے کو کس دل سے برداشت کر سکتے ہیں؟!

میں اب اپنے مخدوم و فخر قوم جناب ادیب الملک نواب خیال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی عنایت سے اُن کی "داستانِ اُردو" کا یہ باب آج ملک کے سامنے پیش ہوتا ہے ۔ مجھے اپنی قوم سے قوی امید ہے کہ وہ اسے پڑھے گی، سمجھے گی اور اُردو کے لیے اپنی جانیں تج دے گی ۔ اے خدا تو ہماری اس آرزو میں چار چاند لگا اور ہماری زبان کو آفتاب کر دکھا ۔ آمین!

اب میں اپنے محترم دوست مولانا شائق احمد عثمانی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ نے "مغل اور اُردو" کو ایک مہینہ سے بھی کم مدت میں حلیہ طبع سے آراستہ کر کے اردو کی ایک گرانقدر خدمت انجام دی ہے ۔ خدا ان کی محنت کو بارآور کرے اور انھیں توفیق دے کہ وہ ادیب الملک ممدوح کی مکمل "داستان اُردو" جلد سے جلد قوم کی خدمت میں پیش کریں ۔

اب میں خمخانۂ ادب کے جرعہ نوشوں کو صلائے عام دیتا ہوا اپنی اس تحریر کو اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں　　ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

جمیل مظہری کاظمی (ایم ۔ اے)
کلکتہ ۔ مئی ۱۹۳۳ء

مغل اور اردو

فہرست مضامین

تمت

امیر تیمور صاحبقران

چوتھی پشت میں

(۱) ظہیر الدین محمد بابر (از سنہ ۱۵۲۶ء تا سنہ ۱۵۳۰ء۔ مدت سلطنت ۴ سال)

(۲) نور الدین محمد ہمایوں (از سنہ ۱۵۳۰ء تا سنہ ۱۵۵۶ء۔ مدت سلطنت ۲۰ سال) — کامران

(۳) جلال الدین محمد اکبر (از سنہ ۱۵۵۶ء تا سنہ ۱۶۰۵ء۔ مدت سلطنت ۴۹ سال) — مرزا محمد حکیم (میر کابل)

(۴) نور الدین محمد جہانگیر (از سنہ ۱۶۰۵ء تا سنہ ۱۶۲۷ء مدت سلطنت ۲۲ سال) — سلطان دانیال — سلطان مراد

سلطان خسرو — (۵) شہاب الدین محمد شاہ جہاں (از سنہ ۱۶۲۷ء تا سنہ ۱۶۵۸ء۔ مدت سلطنت ۳۱ سال) — سلطان جہاندار — سلطان پرویز — سلطان شہریار

داور بخش عرف بلاقی — جہاں آرا۔ روشن آرا — (۶) محی الدین محمد اورنگ زیب (از سنہ ۱۶۵۸ء تا سنہ ۱۷۰۷ء۔ مدت سلطنت ۴۹ سال) — سلطان داراشکوہ — سلطان شجاع — سلطان مراد بخش

محمد اعظم — (۷) محمد معظم بہادر شاہ (از سنہ ۱۷۰۷ء تا سنہ ۱۷۱۲ء مدت سلطنت ۵ سال) — محمد اکبر — محمد کام بخش — زیب النسا

محمد عظیم الشان — (۸) محمد جہاندار شاہ (از سنہ ۱۷۱۲ء تا سنہ ۱۷۱۳ء۔ ایک سال) — خجستہ اختر

(۹) فرخ سیر بادشاہ (از سنہ ۱۷۱۳ء تا سنہ ۱۷۱۹ء۔ ۶ سال)

(۱۰) محمد شاہ بادشاہ (از سنہ ۱۷۱۹ء تا سنہ ۱۷۴۸ء۔ ۲۹ سال)

(۱۱) احمد شاہ بادشاہ (از سنہ ۱۷۴۸ء تا سنہ ۱۷۵۴ء۔ ۶ سال)

(۱۲) ظہیر الدین عالمگیر ثانی (از سنہ ۱۷۵۴ء تا سنہ ۱۷۵۹ء۔ ۵ سال)

(۱۳) عالی گوہر شاہ عالم (سنہ ۱۷۵۹ء تا سنہ ۱۸۰۶ء ۴۷ سال)

(۱۴) محمد اکبر ثانی (سنہ ۱۸۰۶ء تا سنہ ۱۸۳۷ء ۳۱ سال)

(۱۵) بہادر شاہ (سنہ ۱۸۳۷ء تا سنہ ۱۸۵۸ء۔ ۲۱ سال)

مغلوں کا نسب نامہ

مغل اور اردو

مغل! یہ وہی مغل ہیں جو باغِ ہند کے آخری باغبان کہلائے اور جن کی ریاضتوں نے اُسے گلزار بنایا اور صدیوں[1] کی عرق ریزیوں کے بعد جن کے اقبال کی بہار پلاسی کے میدان میں آخر خزاں ہو گئی۔

امیر تیمور اس گھر کا وہ پہلا صاحب قراں ہے جس کے بازوؤں نے دو ملکوں کے ستاروں کو کھینچ کر پھر ملا دیا۔ خاندانِ تغلق کے سرنگوں ہونے پر اس گیتی ستاں کے قدم ادھر آئے اور اس کی پولاد تن و پنبہ پوش قوم اس نرم و گرم زمین پر ایک سال جمی اور کھڑی رہی۔ اس کا اُردو، دلی کو زیر و زبر کرتا، ہر دوار پر چڑھتا اُترتا اور پنجاب کو روندتا ہوا گھر لوٹا تھا!

---

[1] بابر نے سنہ ۱۵۲۶ء میں ہندوستان لیا اور بہادر شاہ ظفر نے سنہ ۱۸۵۷ء میں لٹ گنوایا یوں مغلوں نے تین سو اکتیس سال اس ملک پر حکومت کی اور اگر امیر تیمور کے حملہ کو بھی خاطر میں لایا جائے تو ہندی منگولی (مغل) تعلقات ساڑھے چار سو برس قائم رہے۔ تیمور نے سنہ ۱۳۹۸ء میں اس ملک کو فتح کیا تھا۔

ایسے طوفان میں قومیں اور زبانیں ہلتی نہیں بکھرتی ہیں اور اگر لودی نہ سنبھالتے تو یہ ہلچل ہمارے شیرازہ کو نہ معلوم کب تک پراگندہ رکھتی سکندر (لودی) کا احسان کہ ارتباط واتحاد کی راہیں اُس نے پھر نکال دیں۔ مگر اُس کی زندگی کی طرح یہ رستے بھی کوتاہ ہو گئے۔ ابراہیم اُس کا خلف الرشید نہ تھا۔ وہ اور معاملات میں پھنسا۔ اور آخر پانی پت کے تاریخی میدان میں جاکر سلطنت وجان ہار کر پردۂ خاک میں چھپ گیا۔ بابر کی جیت اور مغلوں کی نام آوری شروع ہوئی اور ترکوں کا آفتاب اقبال درخشاں ہونے لگا۔

بابر تلوار ہی کا دھنی نہیں بلکہ قلم وزبان کا دھنی بھی تھا۔ ادب وشاعری اسکی فطرت میں تھی۔ جب اسے بیس نکالا ہوا، اور تاشقند پہونچا تو وہاں شکار وشاعری ہی اسکے دو بہترین مصاحب تھے۔ کوہ وبیابان میں تیر وتفنگ چلاتا اور آب رواں کے کنارے بیٹھا غزلوں سے جی بہلاتا اور عالم سرور میں کہتا ؎

نوروز ونوبہار دمی دلربا خوش است ؛ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسی پر جوش طبیعت پر اس چمن کی سیر ایک اور تازیانہ تھی۔ وہ سودا یہاں

بڑھا اور اپنے پرانے مشغلہ کو ہمیشہ تازہ کرتا رہا۔

سکندر (لودی) کے بعد اور نوسو بتیس ہجری[1] اور پندرہ سو چھبیس[1526] عیسوی کے یادگار سن میں ہمارے ملک کی زبان کیا تھی؟ اِسے ہم فردوس مکان (بابر) ہی کی زبان سے سناتے ہیں۔ ایک مقام پر جب اسکے ایک نامی سردار نے شکست کھائی اور یہ خبر اُس نے پائی تو اس کا ذکر اپنے تزک[2] میں کر کے لکھتا ہے کہ "سردار کی یہ پسپائی قابل عفو ہے۔ غیر زمین، غیر کفو ہی نہیں بلکہ غیر زبان سے مقابلہ۔ نہ ہم یہاں کی بولی بولی سمجھ سکتے اور نہ یہاں والے ہماری زبان جانتے ہیں!" پھر ایک جگہ آگرہ کے ذکر پر کہتا ہے کہ "ہمارے آدمیوں کے لیئے یہاں کی زبان نئی ہے اور وہ اس سے بھڑک رہے ہیں"

قلعۂ ملوٹ کا محاصرہ ہے مشہور دولت خاں سردار حاضر ہوتا ہے۔ بادشاہ بابر اس کی سننا چاہتا ہے۔ مگر دونوں بے زبان ہیں۔ ایک دوسرے کی نہیں سمجھتا۔ آخر ترجمان لایا جاتا اور وہ بادشاہ و سردار کی زبان بنتا ہے۔ یہ حکایتیں بتاتی ہیں کہ اس وقت یہاں ترکی و فارسی

[1] ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان فتح کیا۔ [2] تزک خود نوشت حالات یادداشت بیگم فی ۱۲

اپنی گویائی کھو چکی اور ملک وہ بولیاں بول رہا تھا جو ان ترکوں اور فارسیوں کے لیئے غیر اور ناآشنا تھیں۔

غور کرنا چاہیئے کہ غیر ملکیوں کو یہاں جمے ہوئے نو سو برس ہو چکے تھے وہ مالک الملک تھے۔ جب چاہتے زبان کی کایا پلٹ دیتے۔ مگر نہیں وہ اس زمین کی آب و ہوا سے آشنا ہو چکے اور خوب جانتے تھے کہ خلاف فطرت کام کا نام ظلم اور زیردستوں کی گردن کشی ہے۔ انھوں نے یہاں کی زبان کبھی نہیں کھینچی بلکہ اسے چاہتے، سیکھتے اور یوں رعایا کا دل بڑھاتے رہے۔

بابر کو بن دیکھے ہندوستان کا عشق اور یہاں کی چیزوں سے شغف تھا۔ کابل میں بیٹھا ہمارے آموں اور پانوں کو یاد کرتا ہے اور جب یہ چیزیں بے مانگے دفعتہً ہاتھ لگتی ہیں تو خوش ہو کر اپنے تزک میں اُسکا ذکر کرتا، شکر بجا لاتا اور اسے نیک شگون سمجھتا ہے۔

وہ پر مذاق و ہمہ گیر بادشاہ اس ملک سے صرف زبانی محبت نہیں کرتا بلکہ یہاں آتے ہی اپنی پیاری رعایا کی پیاری زبان کو بھی منھ لگاتا اور اسے خلعت نظم تک بخشتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے تخیلات و

جذبات کے پتلے کو، ترکی خرقہ اور ہندی جامہ ساتھ پہنایا اور شوخیوں کے ساتھ محفل میں اُسے یوں جلوہ دیا؎ [1]

مجکا نہ ہوا کچھ ہوسِ مانک و موتی ÷ فقرا هلیغہ بس بولغوسیدر پانی و روٹی

مجھ — کچھ — یاقوت — نقیر — روٹی

بادشاہ کہتا ہے کہ۔ مجھے یاقوت اور موتی درکار نہیں۔ فقیر مست ہوں ایک گردۂ نان اور ایک کوزۂ آب بس ہے۔

آپ کی اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظلِّ اللہ کے منھ سے نکلا ہوگا تو نہ معلوم محفل کا کیا رنگ اور درباریوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتنی واہ واہ ہوئی ہوگی۔ اور پُر مذاق خادمانِ دَولت نے، موتیوں کے کتنے طبق وارے ہونگے۔ اور رعایا اپنے بادشاہ کی زبان سے اپنی بولی سُن کر خود کو کس طرح نثار کرتی ہوگی!!

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مانک اور موتی ہندی ہے

[1] بابر کا یہ اردو شعر اس کے ترکی دیوان میں اسُ کے قلم کا لکھا ہوا رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس شعر کی بحر کا نام۔ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف تھا اور اس کی تقطیع یوں ہے۔

مجکان، ہوا کچ، وسی مان، ک موتی ÷ فقرا، غ بس غلو، سدر پان، ورروٹی

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن ؛ مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن

غریب ترکوں کے یہاں موتیوں کا یہ مینہہ کہاں برستا تھا کہ ترکنوں کا وہ سنگار ہو سکتے۔ اور ان کی تخئیل میں وہ مدد دے سکتے۔ یہ تو آپ کے اقبال کے وقت کی سچی کہانی ہے کہ بال بال گج موتی پروئے جانے کے بعد ڈھیر کے ڈھیر بچ رہے تو جوتیوں میں ٹانکے گئے۔ دیکھئے ترکی بادشاہ کی چار[1] برس میں تخئیل تک نئی ہو جاتی اور بات بات میں اسے ہندی بنا دیتی ہے۔

[1] بابر ہند میں کل چار برس زندہ رہا۔ ۱۵۳۰ء اس کا سن وفات ہے۔

مہابلی جی اور اُردو

جو زبان بادشاہ (بابر) کے مُنھ لگ چکی ہو اس کا سلطنت کے دودھ سے پلنا کیا بڑی بات تھی۔ ایسا ہی ہوتا۔ مگر بابر کی عمر نے وفا نہ کی اور ہمایوں برگشتہ تقدیر رہا۔ اُس کے سخن رس کو موقعہ ملتا تو اُسی وقت یہ زبان شہد و شیر سے دھوئی بلکہ نہلا دی جاتی۔ ادب کے جس فدائی اور سخن کے جس شیدائی نے اپنے بھائی کامران کے اس شعر ؎

کامران تا کہ جہان است بقا　　خسرو دہر ہمایوں بادا

پر حصار فیروز بخش دیا ہو اپنے باپ کی اس مُنھ بولی (اردو) پر سمرقند و بخارا تک نثار کر دیتا۔

مگر اور شرفوں کے ساتھ یہ شرف بھی اکبر ہی کے لیئے اٹھا رکھا گیا تھا۔ جب وہ بخت ہو کر بیٹھا تو ادھر بھی متوجہ ہوا۔ بکرماجیت کا وقت یاد آیا اور اپنے دربار کو بھی نو رتن سے سجایا۔ چار ایوان[1] کھڑا کیا گیا اور زبان و ادب کا وہاں درس دیا گیا۔ یہ اسی مدرسہ کا فیض تھا کہ حکیم ابو الفتح کی

[1] فتح پور سکری (آگرہ) کی ایک عمارت جو علمی مشغلوں کے لیئے وقف تھی ۱۲

موت اور حکیم ہمام کی حاضری پر طالب آملی نے یہ رباعی[۱]

مہر دو برادرم و دمساز آمد | او شد بہ سفر، وین سفر باز آمد
او رفت بہ دنبالہ و عمر برفت | وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

عرض کی تو سخن فہم بادشاہ نے فرمایا کہ۔ یہ دنبالہ کھٹکتا ہے۔ اور پھر اصلاح دی کہ ؎ او رفت و رفتنش مرا عمر برفت۔ اس پر آملی نے سر تسلیم خم کر کے آداب عرض کیا۔ یہ انھیں صحبتوں کا اثر اور راجہ مان سنگھ و بیربل کے سے رتن کی چھوٹ تھی کہ اردو کے جواہر پارے بھی اس محفل میں رنگ و چمک دینے لگے۔ نقل ہے کہ جہانگیر، ابوالفضل کے قتل کے بعد منھ چھپائے پھرتا اور بادشاہ کا سامنا کرتے شرماتا تھا۔ اکبر کا غم و غصہ کم ہونے اور شاہی طلبی پر حاضری کے لیئے نیک ساعت کی تلاش کرتا اور اپنا عندیہ عرض کر بھیجتا ہے۔ بادشاہ اسکی عرضی پر یہ رباعی[۱] دستخط[۲] کرتا ہے

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت۔ تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت۔ ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

---

[۱] تذکرۂ جلوۂ خضر صفحہ ۷۴
[۲] عرضیوں پر بادشاہوں کی تحریر کو دستخط کرنا کہتے ہیں ۱۲۔

ایسے درسوں سے چھٹی ملتی تو فارسی، ہندی کتاب کھلتی اور دونوں کا تال میل شروع ہو جاتا۔ کبھی مہا بھارت کا میدان نقیب خاں کے سپرد ہوتا اور اُسے رزم نامہ کا خطاب ملتا۔ اور کبھی رامائن کی کتھا کہی جاتی اور کشن و گنگا دھر کے ساتھ مُلّائے بدایوں کی زبان بھی صاف کی جاتی۔ امیر حمزہ کی داستان ختم ہوتی اور سری بنس کا قصہ چھڑتا اور مُلّا شیری سری کرشن جی کا نام جپتا۔ آج سنگاسن بتیسی کی پتلیاں ناچتیں، حکمت کا راگ چھیڑتیں اور خرد افزا سمجھی جاتیں تو کل، کلیلہ و دمنہ کے طلسمی حیوان گویا ہوتے۔ چٹکلے لطیفے کہتے اور عیار دانش بنتے۔ کبھی لیلیٰ و مجنوں (عربی) اور شیریں خسرو (فارسی) بدیسی سمجھ کر محفل سے اٹھائے جاتے اور ان کی جگہ سدیشی نل دمن لیتے۔ زلیخا کی ملک رانی دروپدی کو ملتی اور زبیدہ کی حرم سرا، سیتا جی کے نیگ لگتی۔ ابو الفضل جُھک کر اپنے آئین[1] کے قواعد اور فارسی میں ہندی کے جوڑ دکھاتا۔ اور اپنے فضل و کمال کی داد لیتا۔ فیضی مؤدب ہو کر لیلاوتی کا حساب پیش کرتا تو مکمل خاں دو زانو ہو کر تاجک کی شکل و ہیئت بتاتا۔ سرہندی

---

[1] آئین اکبری جس میں ابو الفضل نے فارسی کے ساتھ ہندی لفظوں کے نگینے بھی بٹھا دیئے ہیں ۱۲

(حاجی ابراہیم) آداب بجا لا کر آرتھر وید اکی حکمت سناتا اور خان خاناں (عبدالرحیم) دعائیں دیکر جوتش سے نیک لگن اور شبھ گھڑی بتاتا۔

غرض یہ چرچے اور یہ قصے مہینوں نہیں، برسوں رہے۔ اور محفل دربار سے نکل کر ہزاروں اور عوام کے کانوں اور زبانوں تک پہونچے۔ انھیں سخنوں نے رفتہ رفتہ خیالات پلٹے، دو قوموں کے سروں کو اکٹھا اُن کی زبانوں کو ایک اور ان کے تخیلات کو یکسو کر دیا۔ بادشاہ خوش اور رعیت پھولوں نہ سماتی۔ ظل اللہ کو مہابلی جی پکارتی۔ اور اُن کے درشن کو مکت (نجات) جانتی۔ مہابلی جی سونے، روپے میں تُلتے، تُلادان کرتے، برہمنوں کی گود بھرتے اور ان کی دعائیں لیتے۔ شمع کافوری بجھتی، اکاس دیا جلتا اور بصلا آسن سے بدلتا۔ نوروز کے رنگ میں ہولی کھلتی اور شبرات دِوالی گلے ملتی۔

جہاں رسم و رواج کی پگڑیاں یوں بدلیں[1] وہاں زبانوں کو ملتے اور بدلتے کتنی دیر۔ بھاشا سے اخلاص اتنا بڑھا کہ فارسی کرنگ (اسپ) کا حرف کاف کھٹکا اور بدی[2] کی علامت سمجھکر بدلا گیا کہ شاہی اصطبل اخورنہ ہو

---

[1] یہاں پگڑی بدلنا یگانیت کے معنوں میں ہے جیسے پگڑی بدل بھائی۔ دو دوستوں نے ایک دوسرے کی پگڑی لیکر باندھلی اور وہ بھائی ہوگئے [2] بھاشا میں حرف ک برا سمجھا جاتا ہے کرنگ گھوڑے کی ایک قسم تھی اسکے ک کو س سے بدلکر سرنگ کر دیا گیا

اس لیئے اسے سُرنگ (بجائے کرنگ) بنا کر کھڑا کر دیا۔ الٰہ آباد (شہر) گنگا، جمنا کے سنگم پر تھا۔ ماگھ میلہ میں ایشور (خدا) کا نام وہاں لیا جاتا تھا اس مناسبت سے وہ الٰہ باس پکارا اور یوں اردو بنایا گیا۔ ازاں قبیل قوم اور زبان کی اصلاح و اتحاد کے لیئے ایسے کھیل ہر گھڑی کھیلے اور فارسی، ہندی کے جوڑواں پتلے بیٹھے بیٹھے کھڑے کیئے جاتے۔

شاہ کی ایسی گدا نوازی اور رعایا پروری نے موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ توڈرمل[1] کی وفاداری کو اور چمکایا۔ ان کے حساب میں شاہی زبان (فارسی) کی پوجا کا یہی وقت نکلا۔ تمام قلمرو میں فارسی کے آداب و خیال کا فرمان و پروانہ گیا۔ تعلیم عام ہوئی۔ شودر[2] تک دوات پوجا کرنے لگے۔ اور فارسی ہندی کی گنگا جمنی مسندیں بچھنے اور سکندر (لودی) کے وقت کی برکت یاد آنے لگی۔

بادشاہ اس یک جہتی کو دیکھ دیکھ مسکراتا، باغ باغ ہوتا، پھولوں نہ سماتا

---

[1] تو ڈرمل وزیر مال تھے اور ملک کا حساب کتاب انکے ہاتھ میں تھا۔

[2] سکندر (لودی) کے بعد دوسری مرتبہ ملک میں تعلیم عام ہوئی ہندوؤں کے وقت میں بچارے شودروں کو لکھنا پڑھنا منع تھا۔ اکبری عہد میں وہ آزاد ہو کر آدمی بنے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے بھائی کایستھ بھی شودر ہی میں وہ لکھ پڑھ کر اور فارسی سے آشنا ہو کر سرکاری دفتروں کے امین بنے۔ دوات پوجا اُن کی ایک خاص رسم اور ایک بڑا پرب ہے ہر سال ہر ایک دن وہ اپنی تعلیمی آزادی کی خوشیاں کرتے یہ تہوار مناتے اور قلم دوات کے آگے سر جھکاتے ہیں

اور اپنی تدبیروں پر ناز کرتا۔ اسی دوران میں اگلی پچھلی باتوں پر نظر کر کے اس (ہندو مسلم) عقد اتحاد کو ہمیشہ ہمیش کے لیئے مضبوط تر و محکم تر کر دینے کا خیال آیا اور وہ ہمہ تن ادھر متوجہ ہو گیا۔[۵۱]

صاحبو۔ ملّائے بدایوں[۵۲] (مشہور مورّخ) لاکھ گھوریں اور نظر لگائیں مگر جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ راجہ مان سنگھ و بیربل ہی ہمارے ہمراہ نہیں بلکہ ابوالفضل و فیضی کے ساتھ ملّا فتح اللہ شیرازی بھی ہمارے شریک ہیں۔ یہ عقد اتحاد بندھے گا اور ضرور بندھے گا۔ ہندو مسلم رشتہ مضبوط ہو گا۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) دولہہ بنے گا۔ بادشاہ خود بیاہنے جائے گا۔ رجپوتوں کی عزت بڑھے گی۔ برات جمے گی اور رچے گی۔ مَنڈھا چھوایا جائے گا اور خوشی کا یہ گیت گایا جائے گا۔

پربت بانس کٹا مورے بابُل   نئے کا منڈھا چھوائے رے
منڈھے اوپر کلس[۵۳] براجے   دیکھیں راجہ رائے رے

۵۱۔ مغلوں میں اکبر پہلا بادشاہ ہے جس نے بیس سال کی عمر (۱۵۶۲ء) میں راجہ بہاری مل (والیٔ امبر جے پور) کی راج کماری سے شادی کر کے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کیا۔ سلیم (جہانگیر) انھیں کے بطن سے ۱۵۶۹ء میں پیدا ہوا۔

۵۲۔ ملا عبدالقادر بدایونی مشہور مورخ ہیں۔ ملا صاحب دربار اکبری کے ایک رکن اور نورتن کے شریک ہیں مگر اور رتنوں سے کٹے جاتے اور اکبر سے بہت ناراض ہیں۔ سلیم کی اس شادی سے بھی خوش نہیں۔ یہ رشتہ ان کے لیئے بھاگوان اور یہ اتحاد انھیں سازوار نہیں۔ ۵۳۔ کلس ترکی اور سندی لفظ ہے (ڈومس ترکی لغت)

اِن بولوں کے ختم پر دلہن کا چنڈول آئے گا۔ بادشاہ آگے بڑھے گا۔ دولہہ (سلیم) کو بلائے گا۔ اس سے نالکی اٹھوائے گا۔ پھر خود کندھا لگائے گا۔ سب کا دل بھر آئے گا۔ راجہ راؤ سامنے آئیں گے ہاتھ باندھ کر اس عزّت افزائی کا شکریہ ادا کرینگے۔ اور بھرے دل سے کہیں گے ؎

مہارؔی (ہماری) رے بیٹی تہارے (تمہارے) محلوں کی چیری (لونڈی)۔ ہم باند (بندے) گلام (غلام) رے

بادشاہ اس پر بالیدہ ہو کر جواب دے گا نہیں، نہیں ؎

تہارؔی (تمہاری) رے بیٹی مہارے محلوں کی رانی۔ تم صاحب سردار رے

اس پر ایک کوک پڑے گی۔ دُلہن رخصت ہو گی۔ اور رجپوتوں کی بیٹی اکبر کی بہو اور ملکۂ ہند بنے گی۔ اور راجپوت رانی کہلائے گی۔ یہ سب کچھ ہوا اور اکبری و جہانگیری محل اس دن سے اتحاد کا رلچ گڈھ بنا جہاں ہندی و فارسی ملکر رہنے اور شیر و شکر ہونے لگی۔

سلیم (جہانگیر) اور اُردو

بابر کے بعد اور اکبر کی پنجاہ سالہ سلطنت میں ملکی زبان نے نیا جوڑا پہنا اور حاکم و محکوم کی دستار کا جیسا طرّہ وہ بنی اس کا ایک مختصر نمونہ ابھی پیش ہو چکا اور اس سے اتنا سمجھ میں آگیا کہ اب یہی زبان ہمارے رنواسوں[1] اور محلوں میں بے تکلف بولی جاتی اور اکبری شہزادوں شہزادیوں اور خصوصاً سلیم[2] کی مادری زبان اب یہی تھی۔ دانیال (اکبر کے فرزند) کا روزمرّہ بھی یہی تھا۔ اور وہ ہندی داں ہی نہیں بلکہ بھاشا کا شاعر بھی تھا۔ اکبری اور جہانگیری محلوں نے فارسی ہندی کے تعلقات اور گہرے کر دیے اور زبانوں ہی پر اس کا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ ہماری عادتوں اور رسموں میں بھی بڑا انقلاب ہو گیا۔

خرّم (شاہ جہاں) کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں ہندوانہ تھیں۔ یہ پیدا ہوا تو

---

[1] رن واس یا رن باس حرم سرا یا محل۔ رن رانی۔ واس یا باس گھر ۱۲

[2] جہانگیر کی ماں رجپوتن رانی تھی۔ اس کا خطاب مریم زمانی تھا ۱۲

ساری رجیولی ریت رسمیں برتی گئیں زچہ خانہ تک گایا اور ہندی سروں سے جی بہلایا گیا۔ دائی جی شہزادے کو گود میں لیئے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں۔ موتیوں کے تھال سامنے ہیں مگر ان کے بھاویں نہیں لگتا۔ ایک ادا اور بڑے ناز سے سنا سنا کر کہتی ہیں کہ ؎

مانگے ہے جودھا جی کا راج　　للاجی کا نال نہ چھوائے
تھال بھر موتی جودھا رانی لائیں　　وہ (شہزادہ) بھی نہ لیوے یہ دائے

یعنی میں تو جب تک رانی جی کا آدھا راج پاٹ لکھا نہ لونگی بانٹنے والی اور شہزادے (للاجی) کا نال کاٹنے والی نہیں۔ میرے آگے یہ تھال بڑا مال نہیں اسے اٹھا رکھو۔

جہانگیر کے بے تکلفانہ اور شاعرانہ انداز کچھ چھپے ہوئے نہیں۔ وہ صاحب قلم اور اپنے تزک کا مولف تھا۔ زبان کا شوق اور اس کی اصلاح ترقی اس کی بات بات سے ظاہر ہے۔ جو نور جہاں کی بغل میں بیٹھا بادۂ ارغواں کو رام رنگی[۱] کہکر یاد کرتا ہو۔ وہ اپنی پاٹ رانی (جودھا بائی) کے آگے کتنا کھلتا اور آخر کس روزمرہ میں باتیں کرتا ہوگا

[۱] شراب کا یہ رنگین خطاب، جہانگیر کے سے شاعر دل بادشاہ کا بخشا ہوا ہے۔

رانی جودھا بائی بیاہ کر آئیں تو ان کی سہیلیوں اور باندیوں سے محل بھر اپڑا تھا۔ فتح پور سیکری اور قلعہ آگرہ کا ایک بڑا حصہ راجہ بھگوان[1] داس اور مہاراجہ اودے سنگھ کا راج گدھ بن کر رجپوتی اکھاڑہ نظر آنے لگا۔ اس سبھا کا راجہ اِندر جہانگیر تھا۔ وہ ترک کیسا اب تو اچھا خاصہ ہندی اور ہندی راجہ تھا۔ یہاں کی بھاکھا میں پلا۔ اور یہیں کی بھاشا میں بولتا اور ملکی گویوں کو نوازتا تھا۔ کیشو مسر اور پوکھرجی اُس کی صحبت کے آدمی اور اُس کے درباری شاعر ہیں۔ جن پر اُس کی شفقت و مہربانی تاریخوں کی مزیدار کہانی ہے۔

یہ انھیں صحبتوں کا اثر اور مادری زبان کا چسکا تھا کہ ایک مرتبہ جبکہ وہ سفر کشمیر میں سے ترچ ہزارا ایک پرفضا مقام پر پہونچا تو بے چین ہو گیا اور ترکی فارسی کو بھول کر ادھر کی ایک کہاوت[2] کو یاد کرتا اور جھوم کر کہتا ہے کہ ؎

ترچ ہزار الکنا بھلیاں، دھنی کھوب گائیں ؛ سور سکیرتی گھوڑے بھلے اور ہشت نگر کے دھائیں

یعنی ترچ ہزارے کے گیہوں اور دھنی کی گائیں خوب ہوتی اور سورسکیرتی کے گھوڑے اور ہشت نگر کے چاول مرغوب ہوتے ہیں

---

[1] جہانگیر کی دو ہندی رانیاں تھیں ایک راجہ بھگوان داس کی راحت جان اور دوسری مہاراجہ اودے سنگھ کی نور نظر خرم (شاہ جہاں) کی ماں یہی رانی تھیں۔ [2] تزک جہانگیری۔

فائدہ:۔ جہانگیر نے ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء تک یعنی بائیس برس حکومت کی۔

نورجہاں اور اردو

مہرالنسا کا حال، اس کا علم و ہنر اور اس کی خوش مذاقی کسے معلوم نہیں حسن ظاہر ہی نہیں حسن باطن سے بھی وہ مالا مال تھی۔ فارسی اس کے خمیر میں تھی اور قلعے کے باہر اپنا ایرانی انداز دکھاتی ہو مگر آگرہ آکر اور محل میں داخل ہو کر وہ مرزا غیاث کی بیٹی نہیں رہی بلکہ اب ایک ہندی راجہ (جہانگیر) کی حرم و محرم تھی۔ پہلے بھی اس نے محل شاہی ہی میں پرورش پائی۔ اور وہاں اردو سیکھی اور اب تو وہ حرم سرا کی ملکہ بنی ہوئی شاہی کر رہی تھی۔ اس زبان کا نوازنا اس کا فرض اور اسے سرفراز نا اس پر واجب تھا۔ اس میں بھی وہ خموش کیونکر رہتی، مگر خدا کی قدرت، ایرانی خوزادی ہندی رانیوں کو بھی مات کرے اور ان کی زبان میں بھی جو کہہ دے وہ اردو والوں کی دستار کا طرہ بنے۔ وہ اس طرف آتی تو اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتی ہے۔ سنو؎

۱؎ دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک ہیں ہم　　دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس پہ بیباک ہیں ہم

نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق　　تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

۱؎ تذکرہ جلوۂ خضر ۱۲ فائدہ مہرالنسا ۱۶۱۱ء میں نورجہاں بنکر جہانگیر کے عقد میں آئی اور سولہ برس (تا ۱۶۲۷ء) ملکہ بنی رہی۔ جہانگیر کے بعد وہ لاہور میں مقیم ہوگئی۔ اور ۱۹ سال بیوگی میں گذار کر ۱۶۴۶ء میں فوت ہوئی۔

خرم اور اُردوئے معلّٰی

شاہ جہاں کو اردو پر وہی حق و دعویٰ ہے جو کسی صنّاع کو اپنی کاریگری پر ہوا کرتا ہے۔ اور جب تک یہاں کی یہ دو بڑی قومیں (ہندو مسلمان) زندہ ہیں اپنے اس ہندی شہنشاہ کی اس بے مثل صناعی اور اپنی قومیت کی اس زبردست نشانی کو یاد کرتی رہیں گی تاج۔ (جمنا، جامع) مسجد اور قلعۂ معلّٰی کی سی شاندار عمارتوں کے ساتھ اردوئے معلّٰی[1] کی یادگار عمارت بھی اُسی فیاض و سیر چشم بادشاہ کے مبارک نام سے قائم رہے گی۔

خرّم اردو کی گود میں پیدا ہوا۔ اور اُسی کے دامن میں پلا۔ اذان کے بعد جو پہلی آواز اس کے کانوں میں پڑی وہ اسی زبان کی صدائے خوش تھی۔ زچہ گیری اور چھٹی چلہ کے گیتوں اور لوریوں کے

---

[1] صاحب ظہیر الانشا لفظ ریختہ و اردو کی بحث میں لکھتے ہیں کہ۔ اکبری عہد میں جو مردانہ زنانہ بزار قلعہ میں لگتا تھا اُسے اردو کہتے تھے۔ جہانگیر کے وقت میں بھی یہ آباد رہا۔ وہاں لین دین بدستور اسی نئی مخلوط زبان میں ہوا کرتا تھا۔ شاہ جہاں نے اسے اور رونق دی۔ "ایں بازار شاہی کہ بہ تعظیم نام او اردوئے معلّٰی بود بہ ہمیں مناسبت نام ایں زبان تازہ مرکب تیمنًا اردوئے معلّٰی قرار یافت" ۱۲

دیکھیے سروں میں اُس نے اپنی اسی مادری زبان کے الفاظ سُنے اور یہ اسی کا اثر تھا کہ خدیجۃ الزمانی[1] کی گود میں رہ کر بھی جب زبان پھوٹی تو دادا (اکبر) کو شاہ بابا اور باپ (جہانگیر) کو شاہ بھائی کہنے لگا۔

دلّی جب شاہ جہاں آباد بن چکی اور بادشاہ کے مبارک قدم اُدھر آ گئے تو اردوئے معلّٰی کا شیر خوار بھی دامنِ دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ گیا۔ اس دن سے یہ طفل، لال قلعہ میں اور شاہ جہاں کے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا۔ اس بچہ پر اُس نے شفقت کا ہاتھ رکھا اور اُس کی نشو و نما میں ہمیشہ شاہانہ سلوک دکھاتا رہا۔

طاہر جہانگیری نے، اردو کے اسی زبردست سرپرست کے ایما سے اپنی مشہور کتاب کوک سار ترتیب دی۔ سُندر داس گوالیاری اور سرومنی کے سے کویوں کو اپنے تختِ طاؤس کے پاس اسی نے کرسی امتیاز بخشی، سُندر داس کو مہا کوی راجہ کا خطاب عنایت کیا

---

[1] خرم پیدا ہوا تو اکبر خوش خوش لے کے اپنی ملکہ خدیجۃ الزمانی کی گود میں ڈال آیا۔ بادشاہ بیگم نے خرم کو بیٹا بنا کر پالا، یہ خدیجۃ الزمانی ہندال مرزا کی بیٹی اور ترک تھیں۔ ایسی ترکن دادی کے پاس رہ کر بھی اُس نے اپنی مادری زبان (اردو) کو یوں برتا اور اُس کی قدر کرتا رہا۱۲

تو سرومنی کے منظوم لغت کی طیاری پر اُسے امتیازی لقب سے یاد فرمایا
ویدک میں پران سکھ کی سی تصنیف اُسی کے عہد (۱۰۶۴ھ) میں
تحریر ہوئی، جگناتھ کلاونت کو کب رائے کہہ کر اُس کا آوازہ اسی
نے بلند کر دیا۔ اور پھر اُس کے بارہ دھر پد سن کر اتنا جھوما کہ اُسے
(جگناتھ کو) سونے روپے میں تولا اور ترازو میں جو چڑھا وہ اُس پر
سے اُتارا!

اس بچہ کے ساتھ صاحب قرانِ اوّل (تیمور) کے پوتے بابر کے
پیار واخلاص کا حال سن چکے ہو۔ اب اُس (بابر) کے پروتے
صاحب قرانِ ثانی کی اُس توجہ کی حکایت بھی سنو جو خاندانی
روایات قائم رکھ کر اس معصوم کے حال پر مبذول کی گئی۔

شاہجہاں نے اُس شیر خوار پر زبانی مہر و شفقت نہیں دکھائی
بلکہ دلی اُلفت سے اُسے گود میں لیا اور منھ سے منھ ملا کر ہمیشہ اُسے
پیار کیا۔ شاہ جب قلعۂ آگرہ میں زچ ہوا تو گوشۂ تنہائی میں اپنے
اسی طفل سے کھیلا اور جی بہلایا کرتا تھا۔ ذکر ہے کہ جب داراشکوہ
عالمگیر کے مقابلہ سے بھاگا اور دارالسلطنت سے دور ہوا تو اُس کے

اور بادشاہ کے درمیان یہی معصوم واسطہ بنا رہا۔ اور ابواب کے ساتھ جب شاہ پر رسل و رسائل کا دروازہ بھی بند ہوا، اور پیکوں اور قاصدوں کے پیر توڑے گئے۔ تو حضرت (بادشاہ) نے عالمگیر سے اس کا گلہ کرا بھیجا۔ ولیعہد (داراشکوہ) کی تسلی اور امداد کی خاطر جو پرچے پیام حجرۂ شاہ سے جاری ہوئے تھے اُن میں ایک شقۂ شاہی کسی طرح اورنگ زیب کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ باپ کی تادیب پر جواب لکھتا اور مراسمِ عبودیت بجا لا کر عرض کرتا ہے۔ کہ ہمارے دشمنوں پر حضرت کی نگاہ لطف و کرم اب تک باقی اور غلام کے خلاف ریشہ دوانیاں بدستور قائم ہیں" آن فرمانِ عالی[1] کہ در زبانِ اہل ہند از دستخط خاص تمبا فرمودہ شاہد ایں معنی ست"!

یہ زبانِ اہل ہند وہی زبان ہے جو اِن دونوں قوموں (ہندو و مسلمان) کے صدیوں کے ارتباط و اتحاد کا ایک خوشگوار نتیجہ اور زمین ہند کا وہ عام میوہ تھی جو بازاریں لایا اور مزے لے کر کھایا گیا اب شاہی دسترخوان پر بھی اُس نے زینت پائی۔ شاہجہاں نے اسے

---

[1] دیکھو مراسلات عالمگیر و شاہجہاں۔ صاحب تذکرہ جلوۂ خضر اس ذکر پر لکھتے ہیں کہ میں نے یہ مراسلہ دیکھا ہے

یوں منھ لگایا۔ اس مناسبت سے وہ شاہجہانی اردو کہی گئی اور پھر ادب واحترام کے خیال سے قلعۂ معلیٰ کی طرح یہ اردوئے معلیٰ کے پاکیزہ ومبارک لقب سے یاد کی گئی!

دارا شکوہ اور اردوئے معلیٰ

دارا۔ ولیعہد سلطنت اور خوبیوں میں شاہجہاں اور انشا وادب ذوق شوق میں دوسرا بابر تھا۔ یہ مطمئن ہوتا تو اتحاد زبان کا نشان بلند ہوجاتا۔ بھاشا اور سنسکرت سے اس کا اخلاص پوشیدہ نہیں کاشی (بنارس) میں بیٹھ کر اس نے پنڈتوں کے آگے زانوئے ادب وشاگردی تہ کیا۔ گیتا کا وہ وظیفہ خواں رہا۔ اور اپانشادوں کو اسی نے سرالاسرار بنا دیا۔ جس نے جوگ وششتا کو فارسی جامہ بخش کر اپنی ددھیالی زبان کو سجایا۔ وہ اپنے گرو بابا لال داس اور اپنے برہمن مشیر و دیوان چندر بھان کے سے شاعر و ادیب کی مدد سے اپنی مادری اور باپ کی پیاری زبان کو کہاں تک سنوارتا۔ گر مشیت اس کے خلاف تھی اور اپنے مذاق وحوصلہ کے موافق وہ کچھ نہ کر سکا۔

یہ زمانہ بھی کچھ عجب بہار کا زمانہ ہے۔ صدیوں کا ارتباط و اتحاد پھل دے رہا، حاکم و محکوم کی زبان ایک ہو رہی اور باغِ ہند میں وہ ہوا چل رہی ہے کہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھتا اور اُن پر اعتبار کر رہا ہے۔ مسلمان، ہندی سے آشنا ہوتا تو ہندو فارسی پڑھتا اور اس پر ناز کرتا ہے۔ اس عہد کی تعلیم و تربیت کا حال، ابوالفضل یوں لکھتا اور اس پر اتراتا ہے:۔

اخلاق، ہندسہ، زراعت، ہیئت، سیاست، منطق، طبیعیات، اور مذہب و تاریخ، ہندو، مسلمان ایک کتب میں ساتھ پڑھتے اور یوں قومی اختلاف مٹتے رہتے ہیں، حیا کرنا، دیانت اور پتن جلی بھی درس میں ہے اس طریقۂ تعلیم سے یہ دونوں قومیں (ہندو مسلمان) بڑھ رہی اور گلے مل رہی ہیں! (آئینِ اکبری)

یہ اسی طریقۂ تعلیم اور صدیوں کے بچوں کے بے تکلف، پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا خوشگوار نتیجہ تھا کہ اُس وقت زبان ہی ایک نہ ہوئی بلکہ اُن کے خیالات بھی یکساں ہو گئے۔ یہ پشتوں کی محنت تھی، دارا شکوہ اسی طرح کے مدرسہ کا طالب العلم تھا۔ اُس کی مذہبی عالموں اور

پرانوں سے گھری رہتی اور ان کی خاطر میں اس کی اوقات صرف ہوتی۔ ہندی سے فارسی اور فارسی سے ہندی میں ترجمے کراتا۔ اور ان دونوں زبانوں کو برابر کا حق دیتا۔ سارسنگرہ کی سی دو ہول کی بیاض اسی کے حکم سے ترتیب پائی اور اپنی انگوٹھی پر پرابھو[1] کی سی نشانی اسی نے کھدوائی۔

عالمگیر اور اردوئے معلیٰ

دیرینہ ترکی ہندی اختلاط اور صدیوں کے میل ملاپ سے بھاشا نے کینچلی بدل کر جو صورت نکالی اس کا نام اردو ہے۔ اور پھر مغلئی ورچھوتی سرکار دربار میں جس طرح وہ پوچھی گئی اور منصب عالی تک پہونچائی گئی اسے اردوئے معلیٰ کہتے ہیں۔

اس اردوئے معلیٰ اور عالمگیر نے ایک ہی گھر میں ہوش سنبھالا اور کھیل کود کر دونوں ساتھ جوان ہوئے اور پروان چڑھے۔ عالمگیر اب ترک نہیں بلکہ اچھا خاصا ہندی تھا۔ اس میں اپنے بزرگوں کے

---

[1] پرابھو سنسکرت ہے بمعنی غالب۔ شہزادہ کا یہ مونوگرام تھا ۱۲

بہت سے اوصاف تھے۔ وہ اگر میدانِ جنگ میں سرِ لشکر رہا تو اپنے دیوانخانہ میں سرِ دفتر[۵۱] دکھائی دیا۔ زبان کا شوق اس میں فطری و موروثی تھا۔ اور جہانگیر و شاہجہاں نے اگر یہاں کے شعرا اور خصوصًا باباتلسی داس کو نوازا تو کب کا سازبان آور کوئی زمانہ ولیعہدی سے اُس کے دامنِ دولت سے لپٹا رہا۔ اور یہ کب وہی کب ہیں جو زبانِ شہ (عالمگیر) بن کر جسونت سنگھ پاس جاتے۔ شاہی پیغام سناتے، اپنی شیریں زبانی سے اُسے لبھاتے پر جاتے اور حقِ سفارت ادا کر آتے ہیں!

یہاں کی زبان سے شوق اور یہاں کی بھاکھا سے اُس کی اُلفت کی انتہا یہ ہے کہ جب بنگالہ[۵۲] سے ایک شخص اُس (بادشاہ) کا مرید[۵۳] ہونے آتا اور صلابت خانِ میر توزک اُسے حضور میں پیش کرتا

---

[۵۱] اُسکے رقعات پڑھو اور نثر میں نظم کا مزا لو [۵۲] دیکھو سوانح سال سی و سوم [۵۳] یہ سلسلہ پیری مریدی اکبری رمزوں سے ہے اس طریقے کا بادشاہ مرشد تھا۔ دور و نزدیک کے لوگ بلا قید مذہب و ملت جوق جوق آتے بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے، دعائیں لیتے اور مریدین کر اُس کے حلقہ بگوش ہو جاتے۔ ایسے مریدوں کی ملک میں ایک طاقتور جماعت قائم ہو گئی اور اکبری سیاست میں وہ بڑے کام دیتی تھی۔ یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ اور اُس سے بہت فائدہ اٹھایا گیا مگر بعد کو اُس (اکبر) کے خلاف اس مفید چیز کو آگے نہ بڑھا سکے۔ جہانگیر کا زمانہ تخیل کے نذر ہو گیا۔ کیا حاصل تھا۔ شاہجہاں میں صلاحیت تھی مگر اب ابوالفضل کہاں تھا کہ ان طریقوں سے پولیٹیکل فائدہ حاصل کیا جا سکتا۔ عالمگیر سخت گیر تھا وہ ایسے طریقے کو کیا خاطر میں لاتا۔ اُس نے جہاں اور اکبری آئین کو توڑا وہاں اس طریق فرمیسنی کی گردن کو بھی مروڑا

ہے تو وہ (عالمگیر) مسکراتا اور عربی فارسی مثل کے عوض بے اختیار یہ ہندی کہاوت ہے۔

ٹوٹی پینڈی باورہ دینڈی کو واڑے بیچ + چوہا مگدن باولے تو گل باندھے چھیچ سناتا ہے۔ یعنی چوہا بل میں نہ سمائے اسکی دم میں باندھیں چھاج (سوپ) (سولی اپنے پیتوں آپ بھاری)۔ اس پیری مریدی پر بادشاہ ہنستا، اور کہتا ہے کہ "فقیر خود، درماندہ، کرا رہبری کند"۔

عالمگیر علوم وفنون کا سرپرست اور ادب وانشا کا مربی تھا باخبر ومنصف دنیا اُسے راجہ بھوج اور سکندر (لودی) کے برابر سمجھتی اور اُس کی قدر کرتی ہے۔ تو تورل کی مشہور تعلیمی اسکیم اُس کی توجہ کی ممنون اور یہاں کی تعلیم عامہ اُس کی فیاضیوں کی زیر بار احسان ہے، مسٹر کین تک اپنی مشہور کتاب "مغل ایمپائر" میں ناقل ہیں کہ "تعلیم کی طرف رغبت ہونے اور اُسے عام پسند بنانے کی خاطر بادشاہ نے طلبہ کے لیئے ایک آنہ سے لے کر آٹھ آنہ روز تک وظیفہ مقرر کر دیا تھا"۔ جہاں وظیفوں کا یوں مینہ برسے وہاں کشت علم کیونکر سرسبز اور تعلیم کا چرچا کس طرح گھر گھر اور عام نہ ہو جائے؟ اور اس کے یاد

دلانے کی ضرورت نہیں کہ اس جگ کی الٹی اس کلجگ کی اٹھتی پہ بھاری تھی!۔ بادشاہ کی یہی ایک فیاضی نہیں، رعایا اور زبان کے ساتھ اور فیاضیاں بھی تھیں۔ محمد فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں خبر دیتے ہیں کہ "عربی و فارسی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملکی علوم زبان کی تعلیم کا رواج بھی اسی شاہنشاہ کے فرمان[1] سے پڑا۔"

علوم و فنون کے اس (عالمگیر) مربی اور رعایا کے اس سرپرست و حامی کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس ملک میں جبری تعلیم کی بنیاد اس نے کس طرح ڈالی۔ وہ ہمارے بھائی بوہروں[2] کی تعلیم سے بے خبری کا حال سنتا ہے تو بے چین ہو کر فوراً معلمین و استاد ان تک بھیجتا ہے اور جب اس پر بھی دلخواہ رپورٹ نہیں آتی تو حکومت کے فرائض کو سمجھ کر اُن کے لیے جبری تعلیم کا حکم[3] نافذ کرتا اور انھیں انسان اور دنیا میں جینے کے قابل بنا دیتا ہے!۔ یہ تھی آج سے تین سو سال قبل ہماری تعلیم۔ اور یہ تھا وہ فرمان جو ایک قوم کی درستگی کے لیے نافذ کیا گیا۔ اور یہ تھی وہ

---

[1] شاہی احکام کو فرمان اور شہزادوں کے حکموں کو نشان کہتے ہیں۔
[2] بوہرے وہ فرقہ جو عرصہ سے مغربی حصہ ہند (بمبئی گجرات وغیرہ) میں آباد اور مختلف قسم کی تجارت میں مشغول اور مشہور ہے [3] ایڈ (انگریزی) جلد اول صفحہ ۲۷۷-۲۷۸۔

وہ نعمت جو اِس ملک کو اُس وقت بے مانگے مل گئی۔ مگر یہ ہے ہماری رو داد کہ تعلیم کا اتنا بڑا حامی اور رعایا کا ایسا خیر خواہ آج کس بُرے نام سے یاد کیا جاتا اور اِس کے سے محسن کا یہ کارنامہ تک کس طرح مٹایا جاتا ہے۔

جو بادشاہ علم و تعلیم کا اتنا حامی، زبانوں کا یوں سرپرست، اور ادب و انشا کا ایسا مربّی ہو وہ اپنے بزرگوں کی یادگار اردوے معلّیٰ[۱] کا کہاں تک خیال نہ رکھتا ہوگا۔ اور گو وہ کہتا ہے کہ؎

غمِ عالم[۲] فراوان ست و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشہ ساعت کنم ریگ بیاباں را

مگر اس پر بھی اُس کی سلطنت کے باغ میں ایسے پھول نظر آجاتے ہیں جو ہمارے غنچۂ خاطر کو کھلا اور ہماری بزم کو جلا دے سکیں۔ اور حق پوچھو تو یہی وہ گل سادہ ہیں جن پر ہماری تصویر کھنچتی اور جن کے ورق پر ہماری زبان چمکتی ہے۔

۱؎ مورخین کہتے ہیں کہ ترکی و فارسی کی طرح عالمگیر یہاں کی زبان (ہندی اردو) بھی بے تکلف بولتا تھا

۲؎ یہ شعر بادشاہ ہی کا ہے۔

کچھ قبل ایک شادی کا منڈھا چھوایا جا چکا اور اس کے بعد ہی ایک زچہ خانہ گوایا جا چکا ہے۔ وہ خوشی و وصال کا ترانہ تھا زمانہ بدلتا اور اب جدائی و فراق کا فسانہ سنا تا ہے۔ عالمگیر دکھن پر چڑھا ہوا ہے۔ لاؤ لشکر ساتھ ہے۔ ہن[1] کا لالچ (دلّی سے) مردوں کو بٹور کر اُدھر لے گیا ہے۔ عورتیں گھر میں ہیں، برسوں گذر گئے۔ دلّی سونی پڑی ہے۔ اور دلّی والیاں اکیلی جدائی کی راتیں گذار رہی اور دُکھ بھر رہی ہیں۔ کہیں سے خبر نہیں آتی۔ دل اُداس اور جی بے چین ہے۔ جب کچھ بس نہیں چلتا تو دکھن کی طرف مُنھ کر کے پکارتی اور اپنی بپتی اور گھر کا حال سناتی اور کہتی ہیں کہ :-

چھپّر پرانے ہو گئے اور کرڑکن لاگن بانس

یہ دیکھو، گھر گرا، یہ چھت آئی، دبے اور مرے۔ جواب نہیں ملتا تو ہار کر اور گھبرا گھبرا کر کاگا کی خوشامد ہوتی اور اس کے ہاتھ سندیسا (پیام) بھیجا جاتا اور گلہ کیا جاتا ہے کہ

آون آون کہہ گئے بیت گئے بارہ ماس

---

[1] ہُن سونے کا ایک دکھنی چھوٹا سا سکہ تھا۔ یہ وہاں بہت عام اور ارزاں تھا۔ اسی سے ہمارے یہاں ہن برسنا کا محاورہ نکلا

کیسے سچے اور وفادار ہو۔ ایک جگ گذر گئی اور خبر نہ لی، اس سے بھی خاطر جمع نہیں ہوتی تو کلیجہ اور پھٹتا اور ٹوٹے دلوں کی یہ آواز دکھن تک پہونچائی جاتی ہے ؎

دلی شہر سہاونا اور کنچن برسے نیر ؛ سب کے کنت بٹور کے لے گئی عالمگیر

اس فریاد پر یہ روکھا پھیکا جواب ملتا ہے۔ کہ

بیٹھی رہو کرار سے من میں راکھو دھیر ؛ ابکہ بچھڑے تب ملیں جب بونہریں عالمگیر

تو حوصلۂ صبر جاتا رہا اور زندگی سے یاس ہو جاتی ہے۔

یہی وہ زبان تھی جو اس صدی میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اسے سوا اردو کے کچھ اور سمجھنا زبان کے اتار چڑھاؤ اور اس کے مدارج سے لاعلمی ہے۔

یہ مصرعہ یوں بھی سنا گیا ہے ع ملتی کرو اس سائیں کی کہ بوہریں عالمگیر۔

زیب النسا اور اردوئے معلیٰ

زیب[1] النسا عالمگیر کے سے فاضل کی بیٹی اور شاہجہاں کے سے خوش مذاق کی پوتی ہے۔ علم اُس کی گھٹی میں پڑا، وہ تربیت کے پالنے میں پلی۔ اور ہنر و سلیقہ کے گہوارے میں جھولی۔ یہ قلعہ معلیٰ کی زیب اور خاندان تیموریہ کی ایک زینت تھی۔ مخفی تخلص کرتی اور فارسی میں اپنے جذبات دہراتی تھی مگر اردو میں بھی اُس نے جو کچھ کہا وہ اس زبان کا سرمایہ ناز سمجھا جاتا ہے۔ شہزادی کا زیادہ تر کلام تلف ہوگیا۔ اس کی اکثر فارسی غزلیں تاریخوں میں ملتی ہیں۔ مگر اس کا اردو کلام اب نایاب ہے۔ مشہور فرنچ تذکرہ نویس بیسیو تاسی خبر دیتے ہیں کہ "زیب النسا کی اردو نظمیں میں نے دیکھی اور پڑھی ہیں"۔ صاحب تذکرہ جلوہ خضر (سید فرزند احمد صاحب مرحوم بلگرامی) فرماتے ہیں کہ

[1] زیب النسا مشہور شاہ نواز خاں (مرزا بدیع الزماں) کی نواسی اور دل رس بانو بیگم کی بیٹی تھی یہ شاہ نواز، شاہ سلیمان صفوی (شاہ ایران) کی اولاد سے تھا۔ شاہ جہاں نے اسکے خاندان کا خیال کرکے عالمگیر اور مراد بخش کو اس کی بیٹیوں سے بیاہا۔ دل رس بانو سے شہزادہ اعظم اور زیب النسا پیدا ہوئے اسلئے شہزادی کی اصل دیسی زبان فارسی تھی۔ مگر وقت کا اثر اور اردو کے اقبال کو دیکھنا کہ زیب النسا اس ملکی زبان کو نہیں بھولتی اور اسے خلعت نظم تک بخشتی ہے۔

ایک پرانی بیاض میں شہزادی کے اردو شعر ہماری نظر سے گذرے ہیں
اُن مرحوم نے اپنے تذکرہ میں یہ تین شعر نقل بھی کر دیئے ہیں۔

جدا ہو مجھ سے مرا یار، یہ خدا نہ کرے ٭ خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

دیکھو۔ کتنا صاف کہتی اور زبان کا انداز کس طرح قائم رکھتی ہے سنو

کہتے ہو تم، نہ گھر مرے آیا کرے کوئی ٭ پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی؟

شہزادی غضب کا شعر کہتی اور آج کے شعرا سے داد طلب ہے ملاحظہ کرو

آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے ٭ خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

اُردو اپنے گھر میں

قدیم فارسی ارتباط اور پھر عربی اختلاط سے شمالی ہند پر جو اثرات پڑے اور اُن کی وجہ سے پنجاب میں ایک مخلوط زبان کا جس طرح رواج ہوا اس کا حال اُوپر[۱] گذر چکا۔ پھر ترکوں، تاتاریوں اور خصوصًا آل غزنہ سے خصوصیت اور آئے دن کی ان سے صحبت کے باعث اُن ملکوں کی بولیوں اور یہاں کی بھاکھاؤں میں جو ملاپ ہو گیا اُس کا

---

[۱] پڑھو عربوں اور پھر ترکوں کی ہند میں آنے کا حال۔

ذکر بھی ہو چکا اور اس سے اتنا سمجھ میں آگیا کہ شمال ہند ایک عرصہ سے ایک ایسی نئی زبان بول رہا تھا جسے نہ فارسی کے نام سے یاد کر سکتے اور نہ جسے ہندی کہہ سکتے ہیں۔

یہ گمنام زبان تغلقوں کے زمانہ اور ۱۲۷۵ء کے قریب پورب آتی اور اِدھر اُس وقت گذر کرتی ہے جبکہ لاہور (قدیم دارالسلطنت) اُجڑتا اور دِلّی راج دھانی بنتی اور سنورتی ہے۔ دِلّی اپنی ایک خاص زبان رکھتی تھی۔ اب وہ پھر ایک زمانہ کے بعد ہند کا مرکز اور پنجاب کی ایک نو آبادی بن کر نئی چھاؤنی کی سی زبان بولنے لگی۔ یہ وہی زبان تھی جسے ادیب فارسی بھاشا کہتے اور میر خسرو جیسے دہلوی کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ دہلوی اب تک اپنے شہر سے نکلی نہ تھی۔ مگر جو تغلق لاہور سے دہلی آئے انھیں دفعتہً دکھن کی یاد آئی اور دولت آباد، ہند کا مرکز بن کر دلی والوں سے آباد ہو گیا۔ ہماری یہ دہلوی ان کے ساتھ اُدھر پہونچی۔ اور کچھ دِن وہاں اپنا نام قائم رکھ سکی مگر بعد کو وہ گجراتی

(اُردو) اور دکھنی (اُردو) بن گئی۔ اُس وقت دلّی بہ ظاہر اجڑی تھی کیونکہ اِدھر سے جو کھیپ دولت آباد گئی وہ وہاں چھاؤنی نہ ڈال سکی۔ یہ جماعت جلد لوٹی اور قاعدہ کے موافق، اُدھر کے بہت سے الفاظ و محاورات کی سوغات بھی ساتھ لائی جو گھر گھر بٹی اور دلّی کے بازاروں میں عام ہوئی۔

دارالسلطنت پھر بدلتا اور دولت آباد سے شاہی ترک دلّی واپس آتا، اور وہاں جمتا ہے۔ دلّی اُس وقت سے مغلوں کے عہد تک آباد اور ہند کی ناک بنی رہی اور جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ شاہ جہاں آباد کے لقب سے یاد کی جاتی اور ادب کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

وہاں کی زبان کا نام اب دہلوی نہ رہا تھا وہ اردو کہی گئی پھر شاہ جہانی اردو پکاری گئی۔ اور بعد کو اردوئے معلّٰی کے پاکیزہ خطاب کی سزاوار ہوئی۔

یہ اردوئے معلّٰی، قلعۂ معلّٰی اور امیروں، رئیسوں کے گھروں ہی میں نہیں بلکہ دہلی کے بزاروں میں بھی عام ہو رہی اور کام دے رہی

تھی کہ عالمگیر، دکھن پر چڑھا اور دلّی والوں کا ٹڈی دَل لشکر اس کے ساتھ اُدھر گیا اور مدتوں وہاں رہا۔

زمین دکھن میں اس طرح اردوئے معلّٰی کا بیج پڑا۔ اور بعد فتح اُدھر سے دکھنی اردو کا جو پھل، فاتحین کے ساتھ ادھر آیا وہ دلّی کے باغ میں تحفہ بنا رہا۔ بعد فتح دکھن، نہ صرف دلّی کے لشکری ہی خوش خوش گھر لوٹے بلکہ اُدھر کے شاہزادے اور اُمراء اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر دار السلطنت میں آ بسے اور دلّی کو آباد کرتے رہے۔ معظم (بہادر شاہ اوّل) نے اِن واردین کی تعظیم کی۔ قطب شاہی شہزادوں کو اپنے تخت کے پاس اعزازی کرسی دی۔ اور باپ (عالمگیر) کی زیادتیوں کی یوں تلافی کی۔ یہ شہزادے اور دکھنی امیر زادے شہر (دلّی) میں اعزاز و اکرام سے رہے۔ اُن کی صحبتوں کا دلّی اور دلّی والوں پر اثر پڑا۔ اس سے نہ صرف ان کی معاشرت و تہذیب اور اُن کے روزمرہ ہی میں فرق آیا۔ بلکہ اس نے اردوئے معلّٰی اور دکھنی اردو کو منہ بولی بہنیں بھی بنا کر یک جان و دو قالب کر دیا۔ دکھن میں زمانہ سے اُدھر کی، اردو (دکھنی) شاہی محلوں اور

دفتروں میں بار پاچکی اور ادیبوں اور شاعروں کی زبان بن چکی تھی
وہ (ادیب) ادھر آئے تو اپنا یہ تحفہ ساتھ لائے۔ دلّی والے اپنے
بچہ (اُردو) کو غیروں کی گود میں یوں دیکھ کر شرمائے۔ آخر متوجہ
ہوئے اور اس طفل کے ساتھ حق پدری ادا کرنے لگے۔ مرزا عبدالقادر
بیدل اور میر جعفر زٹلی، جنھوں نے دکھن کی ہوا بھی کھائی اور اعظم و
معظم کے متوسلین میں سے تھے۔ پرانی صف سے بڑھنے اور اس معصوم
(اُردو) کے سر پہ ہاتھ رکھنے لگے۔ پھر تو ساری دلّی گونج اٹھی اور گھر
گھر سے اسی کی صدا آنے اور دلوں کو لبھانے لگی!

بہادر شاہ معظم، اوّل اور اردوئے معلّٰی

عالمگیر کے شہزادوں کی تعلیم، شاہانہ نہیں، طالب العلمانہ ہوئی اُنھیں
مغربی علوم وزبان (عربی و فارسی) کے ساتھ، مشرقی علوم (سنسکرت
وبھاشا) کی تعلیم بھی دی گئی۔ اور یہ وہ طریقہ تھا جو اُس وقت شاہی
خاندان میں رائج اور امیروں رئیسوں سے گذر کر معمولی گھروں میں بھی
جاری تھا۔

شاہزادہ محمد سلطان (عالمگیر کا بڑا شہزادہ) عالم و فاضل اور علوم و فنون کا مربّی تھا۔ اعظم (منجھلا شہزادہ) بھی اپنے علم وفضل میں مشہور اور یگانۂ روزگار تھا۔ سانسکرت و بھاشا سے الفت رکھتا اور ہندی شعرا کا سرپرست تھا۔ نواز شاعر نے اسی شہزادے کی فرمائش پر سکنتلا کو فارسی جامہ پہنایا۔ اور بعد کو اُسے بھاشا کے روپ میں پیش کیا۔ سُت سئے کی سی سنسکرت تصنیف بھی اسی کے حکم سے تدوین پاکر اشاعت اعظم کے نام سے مشہور ہوئی۔

معظم کو خدا نے دو بڑے اتالیق دیے۔ ایک مرزا عبدالقادر بیدل اور دوسرے نواب خان صادق[1]۔ اور یہ انھیں بزرگواروں کا فیض

---

[1] نواب لطف اللہ خان صادق اُن وزرائے دولت میں سے ہیں جن کے کارنامے ہماری تاریخ کا ایک ضروری جزو ہیں۔ یہ مشہور خواجہ عبدالرزاق گڑھ توڑ (شاہی لقب) کے فرزند رشید اور ابوایوب انصاری رحمہ اللہ کے اخلاف میں سے اور قصبہ پانی پت کے ایک بڑے علمی خاندان سے تعلق رکھتے اور اس پایہ کے تھے کہ عالمگیر نے انھیں اپنے شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لیے منتخب کیا۔ معظم کو ان پر اپنوں کی طرح اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ امیر الامرائی کے سے مقتدر عہدے کے لیے اُمرا میں چشمک اور کشمکش ہونے لگی۔ بادشاہ نے خان صادق کو یاد کرکے اس جھگڑے کو مٹانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے صلح کرا دینے کا بیڑا اٹھایا۔ کامیابی پر معظم نے انھیں خان صادق (یعنی سچے وفادار) کا خطاب عطا فرمایا۔ آج تک وہ اسی لقب سے مشہور ہیں۔ نواب صاحب شاہی تعلقات کی وجہ ہمیشہ دلّی میں رہتے تھے۔ کشمیری دروازہ کی شہر پناہ کے

تھا کہ ماثر عالمگیری اور سیر المتاخرین کے مصنفین اسکے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔ کہ

"یہ چھٹپن ہی میں حافظِ قرآن ہوگیا تھا۔ فن قرأت و تجوید سے خوب واقف تھا اور علم حدیث و فقہ میں تو ایسا کامل تھا کہ ہم عصر علما بھی مانتے تھے عربی ایسی بولتا تھا کہ فصحائے عرب پسند کرتے تھے ترکی اور فارسی تو اسکے گھر کی زبانیں تھیں۔ سانسکرت و بھاشا کا علم رکھتا اور ہندی کویتوں کو بےحد مانتا تھا۔ متانت و تہذیب میں دوسرا عالمگیر اور مروت و سیر چشمی میں دوسرا شاہجہاں تھا!"

نوٹ از ص ۳۷ ۔ پاس اور اس کی فصیل سے قریب ان کی حویلیاں تھیں یہاں انھوں نے ایک مسجد بھی بنائی تاریخ ہوئی کہ "مسجد لطف اللہ خان صادق"۔ یہ مسجد الحمدللہ اب تک قائم اور مسجد پانی بتیان کے نام سے مشہور ہے۔ خان صادق نے اپنے وطن پانی پت کو دوبارہ بسایا تو تاریخ ہوئی کہ "رونقِ ہند شہر صادق باد"۔ نواب صاحب کا خاندان ان کے بعد بھی نام آور رہا۔ ان کے بڑے صاحبزادے نواب معین الدولہ عنایت خان راسخ نے عنایت نامہ کی سی تصنیف چھوڑی اور ان کے دوسرے صاحبزادے نواب محمد شاکر خان نے گلشن صادق کی سی کتاب ترتیب دی۔ اس تصنیف کا ایک نادر نسخہ برلن (جرمنی) لبریری میں اور دوسرا پٹنہ کے خدا بخش خاں کے مشہور کتبخانہ میں محفوظ ہے۔ عنایت خان و شاکر خان کی اولاد نے بھی نام نکالا۔ عنایت خان کے دو فرزندوں میں سے نواب باقر علی خاں پانی پت ہی میں رہے موجودہ نوابان پانی پت ان کے اخلاف میں سے ہیں دوسرے نواب جعفر علی خاں پٹنہ عظیم آباد میں اپنی جاگیر کی نگہداشت کے خیال سے مقیم ہو گئے۔ ان کے صاحبزادے نواب مہدی علی خاں اور ان کے نواسہ بہار کے مشہور شاعر و ادیب شاد علیہ الرحمہ۔ نواب شاکر خاں کے ایک فرزند نواب فاخر خاں بھی پٹنہ چلے گئے۔ ان کے صاحبزادے نواب محمد عیسی خاں اور ان کے نواسے نواب سید جعفر حسین و نواب سید نوروز حسین مرحومان"

معظّم کا علمی دربار مشہور ہے۔ خافی خاں (مشہور مورخ) کا سا خموش صاحبِ قلم اگر حضوری میں ہے تو نعمت خان عالی کا سا بلبلِ ہزار داستان بھی صحبت میں چہک رہا اور میر جعفر (زٹل) کے سے زبان آور کا طوطی بھی بول رہا ہے۔ دیوا شاعر اگر اپنا فارسی، ہندی کلام سناتا تو عالم برہمن کوئی بھی اپنی عالم کیلی (تصنیف) کھول کر رادھا، کرشنا کی داستان لے بیٹھتا ہے۔ رسک پریا (ہندی تالیف) پڑھی جاتی اور خوش مذاق بادشاہ مزے لیتا اور اُس کی شرح لکھنے کا حکم دیتا ہے!

افسوس ہے کہ معظّم کی حیات نے وفا نہ کی۔ مگر اپنی چند سالہ[1] حکومت میں علم و ادب کی شان اور پھر اردو کا نشان جس طرح اُس نے بلند کر دیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس کے جانشینوں نے اس معاملہ میں اُس سے سبق لیا اور فرخ سیر و محمد شاہ کے دور میں اس زبان کا پرچم جس طرح چمکا اس کا قصّہ آگے آتا ہے۔

---

[1] معظّم نے کل پانچ برس یعنی ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک سلطنت رانی کی۔

فرخ سیر اور اردوئے معلّٰی

ہندوستان کی زمین اعظم و معظم کی جنگ کے خون سے ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ یہاں ایک دوسری لڑائی ٹھنی۔ معظّم کے مرتے ہی سلطنت کے دعوے دار و امیدوار کھڑے ہو گئے۔

عظیم الشان (پسر بہادر شاہ) کے حوصلہ مند فرزند فرّخ سیر نے عظیم آباد (پٹنہ) میں سیّد حسین علیخاں بارہہ کی مدد سے تاج شاہی سر پر رکھا اور سیّد عبداللہ خاں بارہہ برادر حسین علیخاں، و صوبہ دار الٰہ آباد کی کمک پر دلّی کا رُخ کیا۔ جہاندار شاہ سے مڈبھیڑ ہوئی، اس نے شکست کھائی اور فرّخ سیر نے سلطنت پائی۔

سیّد حسین علیخاں امیر الامرا ہیں اور وزیر دربار۔ دلّی ان پر فدا ہے اور دلّی والے ان پر نثار۔ دار السلطنت کے گلی کوچہ سے صدا آرہی ہے کہ "دادا امیر المومنین[1] پوتا امیر الامرا" ایسی آوازوں میں

---

[1] یہ صدا حقیقتہً ایک گدا کی تھی جو امیر الامراء کے محل کی طرف سے آواز لگاتا جا رہا تھا اس کے صلہ میں نواب نے اس فقیر کو امیر کر دیا۔ سید حسین علیخاں تین بھائی تھے۔

ادب کی آواز بلند تر ہے اور بادشاہ (فرخ سیر) و وزیر کی تہنیت و تعریف میں نظم و نثر کے گلے پڑے جاتے اور فارسی و ہندی میں جذبات نکل نکل کر فضا میں گونج رہے ہیں۔

مرزا بیدل کا زمانہ ہے۔ بادشاہ ان کا معترف ہی اور وزیر ان کا مدّاح، ان کے ادب و شاعری کا وزن زمانہ کی گردن جھکائے دیتا اور بڑے بڑوں کو ان کے آستان کی جبہ سائی کرائے دیتا ہے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ، اس وقت دکھن کے صوبہ ہیں۔ یہ بھی مرزا کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ مرزا کو بکمال خلوص اپنے پاس بلاتے ہیں۔ مگر نہ معلوم دلّی میں اسوقت کیا مزا ہے کہ وہاں سے نکلنا گوارا نہیں کرتے۔ اور جواب میں یہ شعر تحریر کر بھیجتے اور پیر توڑے گھر میں بیٹھے رہتے ہیں ؎

دُنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش ✣ من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸ بڑے نواب عبداللہ خاں قطب الملک منجھلے یہ اور چھوٹے نواب سید زین الدین علیخاں عرف میر زینا۔ سادات کے زوال پر میر زینا اور قطب الملک کی اولاد پٹنہ عظیم آباد میں جا بسی اور وہاں بہ عزت و توقیر رہی۔ اس خاندان میں نواب سید جعفر حسین خاں اور سید الشعراء جناب شاد باقی تھے مگر وہ بھی مرحوم ہو گئے اس خاندان کی دوسری شاخ اپنے قدیم وطن جانسٹھ (ضلع مظفر نگر) وغیرہ چلی گئی اس گھرانے کے حضرات الحمدللہ اب تک باقی ہیں۔ نواب سید عبداللہ خاں اور نواب سید مظفر علیخاں انکی یادگار ہیں۔

امیر الامرا اور مرزا کے ربط و ضبط کی حکایتیں[1] بھی مشہور اور تاریخوں میں قلمبند ہیں۔ یہ اُن ہی کا اثر تھا کہ سلطنت گردیوں کے بعد بھی دلّی میں ادب و شاعری کی آواز سرد نہ ہونے پائی۔ اور یہ اُن ہی کا فیض تھا کہ قلعہ میں بھی وہ گونجتی اور امیر الامرا کی توجہ سے بلند ہوتی رہی۔ مرزا گو، فارسی گو ہیں مگر اُس وقت کی ملکی زبان سے بھی متاثر۔ ادھر دِل دیے بغیر چارہ اور اردو سے چھٹکارا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے جب اس زبان کو مُنھ دیا تو ان کے دلدادہ امرا نے بھی اسے مُنھ لگایا اور اس سے جی بہلایا۔ مرزا کے یہ دو شعر

مت پوچھ دل کی باتیں اب دل کہاں ہے ہم ہیں
اُس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہی ہم ہیں
جب دِل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہی ہم ہیں

اُس وقت بہت مشہور ہوئے اور پھر جب سے اُردو گوئی کی بنیاد پڑ کر

---

[1] مرزا، اعظم و معظم ہی کے اتالیق نہیں بلکہ اُس وقت کے کل امرا کے استاد تھے۔ سید حسین علیخاں بھی انکا دم بھرتے تھے نواب نے ایک مرتبہ اُن کی خدمت میں ایک لاکھ نذرانہ پیش کیا مگر قناعت کے گھر میں اس کی گنجائش نہ دیکھ کر مرزا نے بعد شکریہ واپس کر دیا۔ بیدل عظیم آبادی ہیں جوانی میں دلّی جا رہے اور ۱۱۳۳ھ میں ہیں مرے۔ ان کے حالات ذرا وضاحت سے [illegible]

فرخ سیر کی شاہی اور سید حسین علیخاں کی امیر الامرائی مدتوں یاد آتی رہی۔

اس وقت کے مشہور اور تاریخی لوگوں میں نعمت خان عالی کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔ ان کے وقائع فارسی اور ہندی کے مزید پیوند سے کشت زعفران کا لطف دیتے اور روتوں کو ہنساتے ہیں۔ انھوں نے گو کوئی مستقل تصنیف اردو میں نہیں چھوڑی مگر وہ خسرو وقت ہیں کہ ان دونوں زبانوں کے نگینے ساتھ بٹھاتے اور انھیں چمکاتے ہیں۔

ان کے بعد میر جعفر زٹل کا حق و درجہ ہے۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے انھیں زٹل کہہ کر اڑا دیا ہے۔ مگر یہ ان کا زٹل قافیہ ہے۔ اردو کو صرف غزلوں کے تنگ کوچوں میں محدود سمجھنا کم بینی ہے۔ یہ میر جعفر اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس اٹھتی ہوئی اور خاص و عام کے منھ لگی ہوئی زبان کو سراہا۔ اور اپنے زمانہ کے واردات و واقعات کو اس اردو میں کہہ سنایا جو اس عہد کا سکۂ رائج الوقت تھی۔

میر جعفر کی بڑی تعریف یہ ہے کہ اُن کا بیان اس عہد کی سچی خبر دیتا اور ضخیم تاریخوں کی پیچدار تحریر کو ایک دو مصرعہ بلکہ ایک دو لفظوں میں

کھول دیتا ہے۔ عالمگیر کی دکھن پر تاخت۔ گول کنڈہ کا محاصرہ اور شہزادوں کی رقابتوں کے سبب فتح میں تاخیر کا حال اور بھاگ نگر (حیدر آباد) کی لوٹ کا احوال تاریخوں کے ورق گردانے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ مگر ان کے یہاں وہی قصہ ایک خاص انداز میں موزوں ہو جاتا ہے اور معمولی دماغوں تک بھی پہونچ جاتا ہے۔ ان کی دوسری تعریف یہی کہ وہ اپنی حق گوئی میں بڑے بڑوں کو نہیں چھوڑتے۔ محمد سلطان اور اعظم و معظم کے متوسلین میں سے ہیں۔ مگر فتح گول کنڈہ اور حیدر آباد کی بربادی پر صاف کہتے ہیں۔

نحستیں کلاں ترکہ بر کھنڈ کرد ہمہ کار و بار پدر کھنڈ کرد

یعنی عالمگیر کے بڑے شہزادہ (محمد سلطان) نے سب برباد اور باپ کی محنتوں کا ناس کر دیا۔

لہ عالمگیر جب دکھن کا صوبہ تھا، میر جملہ کی سازش سے اُس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کو دھوکہ دے کر حیدر آباد پر دفعۃً حملہ کر دیا۔ سلطان سخت پریشان ہو کر قلعہ گول کنڈہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ شہزادہ محمد سلطان اپنے بڑے بیٹے کی کمک سے عالمگیر نے حیدر آباد پر قبضہ کر کے شہر کو خوب لوٹا۔ پھر گول کنڈہ کی طرف بڑھا۔ سلطان نے مجبور ہو کر صلح کر لی۔ شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی قرار پائی کہ عبداللہ قطب شاہ اپنی بڑی شہزادی محمد سلطان کو بیاہ دے۔ اور شہزادہ کو ولی عہد مقرر کرے

چناں لوٹے شد، بستیِ بھاگ نگر نہ خذ ماصفا ماند، نہ ماکدر

یعنی شہر کو بے وجہ اس طرح لوٹا کہ تنکا نہ چھوٹا۔

جہاں ہوئے ایسا کلچھن کپوت لگے خلق کے مُنھ کو کالک بھبوت

یعنی جہاں ایسا پوت ہو وہاں مُنھ میں کالک اور بھبوت کیوں نہ لگے!

اس معاملہ میں جس طرح وہ بڑے بھائی پر آڑی آتے ہیں اسی طرح اعظم پر بھی وار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

دگر شاہِ اعظم ہمہ کن دُر بہ رسوائی انداخت کارِ پدر

یعنی اعظم بھی کچھ کم نہیں اُس نے بھی باپ کو بدنام اور اس کے کام کو برباد کر دیا

بہ خوش داامن و خسپورہ ساختہ بہ للّو پتو کار در باختہ

شہزادہ محمد سلطان کی طرح اعظم کی بھی وہاں ایک شادی ہوئی تھی اُس کی طرف اشارہ ہے کہ حیدرآباد کو سسرال بنا کر وہ وہاں کی پیچ کرتا اور صرف زبانی باتوں دللوپتو سے میدان جیتتا رہا۔ یہ وہ تاریخی نکتے ہیں جو ورق کے ورق پڑھنے پر بھی جلد سمجھ میں نہیں آتے اور یہاں دو ایک مصرعوں میں حل ہو جاتے ہیں۔

میر جعفر، اعظم و معظم کی خانہ جنگیوں سے بھی دل تنگ ہیں عالمگیر کو یاد کرتے اور پھر ان بھائیوں کی لڑائی پر یوں آوازہ کستے ہیں:۔

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ مکمل اکمل و کامل دلِ آگاہ

رگت کے آنجھواں سوں دل رووتا ہے — نہ بیٹھی نیند کوئی سووتا ہے
دوا دَو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے — بچہ در گود، سر کھٹیا دھری ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم — زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں کو مختصر کر — ز دور مختلف دل میں حذر کر

انھوں نے بھی ہر زمانہ کے شاعروں کی طرح اپنے وقت کا شہر آشوب لکھا۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے ؎

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دَور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دَور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دَور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی بچہ بیگانہ جیسن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

ان کی طباعی اور زبان آوری نظم ہی تک محدود نہ رہی۔

نثر میں بھی زبان کھولی اور وہاں بھی اپنی آواز قائم رکھی ہے۔ اُردو لفظوں کو عربی ترکیب دیتے اور ایک مزیدار معجون مرکب[1] تیار کرتے ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر طرزی نے بھی یہ طرز برتی ہے۔ مگر وہاں ذرا سنجیدگی ہے اور یہاں نری ظرافت۔ اس لیئے اِن کی بات ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔ بچّہ بچّہ کی زبان پر وہ آگئے اور ہمارا روزمرہ ہوگئے۔

---

[1] جیسے: چوں گھڑگھڑاہٹ الرعد فی الغمام وکڑکڑاہٹ البرق فی البہرام برسراست....... الخ۔ نہ ہلّد نہ ٹلّد نہ جنبد زجائے۔ بھی ان ہی کی ترکیب و تعریف تھی جو ہمارے زبان زد ہے۔

فائدہ ۔قصبہ نارنول بھی عجب ظرافت خیز جگہ تھی میر جعفر کے بھائی بندوں یا ساتھیوں میں وہاں سید عبدالجلیل اٹل ایک بزرگوار تھے ان دونوں میں گہری چھنتی اور بڑی دوستی تھی۔ زٹل دکھن میں ہیں۔ اٹل اخیر نارنول سے خط لکھتے اور رقعہ یوں شروع کرتے ہیں۔ پناہ بڑائی وچوڑائی میر جعفر بڑے بھائی، ہر روز از یادِ حق سکھی باشند، ختم یوں فرماتے ہیں ؎ زٹل تیری جعفر جہانگیر شد + زٹل گفتن اندر توئی میرشد۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر کے زٹلیات اس وقت کس درجہ مقبول تھے۔

اٹل صاحب نے غزلیں بھی ارشاد کی ہیں۔ دو تین شعر سن لو۔ زیادہ ہوس ہو تو زٹل کا کلیات ملتا ہے اُس میں ان کی تصویر بھی جلوہ گر ہے۔ زیارت کرلو۔

رخسارِ پُربہارِ سجن، رونقِ چمن — یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقّہ جواہر و یا درجِ دُر کہوں، — یا غنچہ گلاب کہوں یا کہوں دہن،
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہی بھونگ — یا زلفِ مشک رنگ ہے یا نافہ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک — شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن

.... — ....

بر توسنِ کرشمہ سوار است نازنیں — سید اٹل زبادۂ دیدار او مگن؛

میر جعفر جب اعظم و معظم سے خوش نہ تھے تو فرخ سیر سے کیونکر خوش رہتے۔ وہ بادشاہ ہوا اور ے

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر ÷ بادشاہ بحر و بر فرّخ سیر

کی ضرب پڑی تو آپ نے چوٹ کی اور فرمایا ے

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر ÷ بادشاہِ پشّہ کش فرّخ سیر

انھوں نے عمر بہت پائی۔ وفات کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ بیسیوں تاسی (مشہور تذکرہ نویس) لکھتے ہیں کہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) تک جیتے تھے۔

فرّخ سیر کا عہد، خافی خاں، وقائع نعمت خان اور میر جعفر (زٹل) ہی کی زبانوں سے زندہ نہ رہے گا بلکہ اُس وقت کے اور فاضلوں اور ادیبوں کے ناموں سے بھی ہمیشہ تازہ رہے گا۔ اِن میں علّامہ سید عبد الجلیل بلگرامی (مشہور میر آزاد مرحوم کے نانا) وہ بزرگوار ہیں جن کا علم و ادب اُس وقت مانا اور ان کی زبان کو سراہا جاتا تھا۔

بادشاہ کی ایک شادی راجہ اجیت سنگھ کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ تو اور ہوا خواہوں کے ساتھ علّامہ صاحب بھی شاد ہوئے اِس مبارک تقریب اور ہندو مسلم رشتے کے پھر قائم ہو جانے کی خوشی میں ایک

مثنوی تصنیف کی۔ اس میں اس شادی خانہ آبادی کی رعایت کا خاص خیال رکھا۔ مثنوی فارسی میں ہے۔ مگر اُس زبان کے لفظوں کے ساتھ ہندی کا جوڑ بھی ساتھ چلا جاتا اور ان دونوں قوموں کا رشتہ یوں جوڑا جاتا ہے۔ یہ مثنوی فرخ سیر کو نذر دی گئی۔ بادشاہ نے اس کی قدر کی اور اس خاص عنایت کی داد دی!

فائدہ:۔ بہادر شاہ کے بعد عظیم الشان اُس کے دوسرے فرزند نے تخت شاہی پر قدم رکھا مگر ذوالفقار خاں ایک سردار نے سر اٹھایا۔ اور دوسرے شہزادوں کو عظیم الشان کے خلاف اُبھارا۔ پنجاب میں جنگ ہوئی۔ لڑائی کے دوران میں عظیم الشان اتفاقاً دریائے راوی میں ڈوب گیا۔ اُدھر سے میدان خالی ہوا تو بقیہ شہزادوں میں چھپنی۔ معز الدین سے سب نے شکست کھائی۔ یہ جہاندار شاہ بنکر تخت پر بیٹھا۔ ذوالفقار خاں وزیر ہوئے۔ جہاندار کی بے ترکیبیوں اور خصوصاً اس کی ایک معمولی عورت کے سر چڑھنے اور اُس کے رشتہ داروں کے اقتدار پانے سے امرا بہت ناراض تھے۔ فرخ سیر (پسر عظیم الشان) اُس وقت بنگالہ میں تھا اور نواب سید حسین علی خاں بہار کے صوبہ دار تھے۔ فرخ سیر نے عظیم آباد (پٹنہ) جاکر اور اپنی شاہی کا حق جتاکر ان سے مدد مانگی۔ پہلے انھوں نے تامل کیا۔ آخر فرخ سیر کی ملکہ اور خصوصاً اسکی ایک بچی کی لجاجت سے مجبور ہو کر ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ فرخ سیر کے سر پر عظیم آباد ہی میں تاج رکھا اور لاؤ لشکر لیکر چلے۔ الہ آباد سے اپنے بھائی سید عبداللہ خاں کو ساتھ لیکر دلی کی طرف بڑھے۔ جہاندار سے جنگ ہوئی۔ اُس نے شکست کھائی۔ اور ذوالفقار نے ذلت اٹھائی۔ دونوں مارے گئے۔ فرخ سیر بادشاہ ہوا۔ اس نے ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک ۶ برس سلطنت کی!

طفلِ اُردو کا مکتب

بچّہ کے پیر پالنے میں یہ مثل اس زبان کے لیۓ اصل نکلی! اُردو کی اٹھان ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ تاڑنے والے اسی وقت تاڑ گۓ تھے کہ یہ نونہال جلد پھیلے گا اور اپنی مراد پر جلد پہونچے گا۔ جس پردیسیوں کا سایہ رہے اور جو شاہوں کو بھایا رہے اس کے بڑھنے اور پنپنے کا ذکر ہی کیا کیا جس وقت کا حال ہم دُہرا رہے ہیں اُس وقت تک ہمارے مُنھ میں تین زبانیں تھیں۔ پہلے فارسی کہ وہ ملک سے رخصت ہو کر راجہ ٹوڈرمل کی وجہ سے پھر سرکار دربار اور دفتر کی زبان بنی۔ دوسری نئی یعنی فارسی بھاشا جس میں معرفت و عبادت کے ساتھ ساتھ ہماری موسیقی کی سریلی آواز بھی شریک ہو کر دلوں کو نرم و گرم کر رہی تھی۔ تیسری اردو کہ اب وہ خاص و عام کا روزمرّہ بنی ہوئی فارسی کو ڈھکیل کر اپنی جگہ بنا رہی تھی۔

اس زبان نے گو اچھے ہاتھ پیر نکالے مگر اب تک وہ بے تالا پڑ رہے اور کسی ایک گت پر اُٹھتے نہ تھے۔ اس لیۓ وہ قاعدہ کے ساتھ ہمارے مُنھ میں بس سکی اور آگے نہ بڑھ سکی۔

اُردو کا اصل گھر دلّی تھا اس لیئے دلّی والوں کو اُسے قواعد سکھانے
یعنی اُس کے باقاعدہ بنانے کی فکر ضرور رکھی۔ یہ فکر یا تو قلعۂ معلیٰ کے محلوں
میں پوری ہوتی یا اُن امیروں کے گھروں میں جنھیں قلعہ سے واسطہ اور
وہاں کی زبان سے رابطہ تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے شاہوں، شہزادوں،
شہزادیوں اور اُن کے اوّل درجہ کے امیروں کی گود میں پلی اور اُن
کی صحبت اٹھا کر اور ادب قاعدہ سیکھ کر باہر نکلی اور ہماری ہم جلیس بنی ہے!
پڑھ چکے ہو کہ بیدلؔ نے کس طرح اِس زبان کا بول بالا کیا اور
سُن چکے ہو کہ اُن کے مقلّد و شاگرد امیروں نے کیونکر اسے مُنھ لگایا؟ اِن
اُمرا میں بزمانۂ فرخ سیر ایک امیر باتدبیر تھا جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک
کہتی اور خلقت نواب محمد امیر خاں کے نام سے یاد کرتی اور بزمِ شعرا،
انجامؔ کے لقب و تخلص سے پکارتی ہے۔ اس شاگردِ بیدلؔ نے اِدھر
دل دیا تو اور اُمرا نے بھی اُن کا ساتھ دے کر اُردو کی طرف رُخ کیا اور
پھر تو دلّی میں اُس کی آواز یوں گونجی کہ سارے ملک میں پہونچی اور
ہر طرف سے اُس کی صدائے بازگشت (ایکو) آنے لگی!۔

نواب عمدۃ الملک نہ صرف فارسی ہی کے اُستاد تھے بلکہ

بھاشا پر بھی قدرت رکھتے اور بقول صاحب سیر المتاخرین (نواب غلام[۱] حسین خاں عظیم آبادی خلف نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ، مشیر محمد شاہ اور دوست خالص عمدۃ الملک) اُن کی ہندی نظمیں ٹھمریاں اور دوہے، دلّی کے باہر بھی گونجتے اور زبانوں اور گلوں سے نکل کر ملک پر چھا جاتے۔

[۱] نواب سید غلام حسین خاں کی امارت و علمیت مشہور اور ان کی زبان دانی و تاریخ دانی جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ سیر المتاخرین ایک ایسی تاریخ ہند و بنگال وہ چھوڑ گئے جو مستند مانی جاتی اور اس کے بعد کی تاریخیں اسکے حوالے سے پُر نظر آتی ہیں۔ اس تاریخ میں بنگالہ کے زوال کے وقت کے وہ کل واقعات موجود ہیں جو نواب صاحب کی نظر کے سامنے گذرے۔ وارن ہیسٹنگ کے متعلق کچھ ایسا تحریر فرما گئے کہ برک کے مقابلہ میں انکا بیان پارلیمنٹ میں پیش ہوکر ہیسٹنگ کا وکیل بنا رہا۔

نواب صاحب دہلی کے اُن امیر زادوں میں سے ہیں جن کا دیوان خانہ وہاں (دہلی) اُردو کا گھر بنا رہا۔ اس لئے پانی پت کے ساتھ ان کے خاندان کی زبان بھی عظیم آباد میں اردوی معلّٰی مانی گئی۔ صوبۂ بہار میں پرگنہ جیلا نواب صاحب کی جاگیر تھا۔ وہاں کے محلات کے علاوہ عظیم آباد (پٹنہ) میں بھی وہ گھر بنا کر رہے۔ حاجی گنج (محلہ) کی بڑی حویلی اسی خاندان کے نام سے سو برس آباد رہی ہمارے بچپنے میں یہ کھڑی تھی مگر اب گری پڑی ہے! نواب بہادر سید ولایت علی خاں مرحوم (پٹنہ کے مشہور رئیس) اور سید الشعرا جناب شاد علیہ الرحمۃ، نواب سید جعفر حسین خاں مغفور اور میرے والد نواب سید نوروز حسین خاں مرحوم اسی حویلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائے؟

نواب صاحب کے خاندان کی جہت سے حاجی گنج (پٹنہ) کی زبان شہر (عظیم آباد) میں مستند تھی۔ اور ہماری یاد تک اس محلہ کا یہ وقار و امتیاز قائم تھا۔ نواب مرحوم اپنی آخر عمر میں مسندِ مرشد آباد سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے دم سے نظامت کی امارت بگڑنے پر بھی بنی رہی۔ مرحوم وہیں مرحوم ہوئے اور نواب مہابت جنگ کے ہزوارڑ میں (اپنے خانہ انی تعلقات کی وجہ سے) بے خبر سو رہے ہیں! عظیم آباد اور اُردو کے ذکر میں نواب مرحوم اور اُن کے والد نواب اسد جنگ کا حال ذرا وضاحت سے ملے گا۔

عمدۃ الملک گو فرّخ سیری امیر ہیں مگر ان کی عظمت و شہرت محمد شاہ کے وقت میں ہوئی اور جبکہ وہ وزیر دربار مقرر ہوئے تو اقتدار اور بڑھا اور بادشاہ کے منظور نظر ہو گئے۔ نادر (شاہ) تک نے اِن کی عزّت کی اور اس قہرمان کی نظر بھی ان پر پڑنے لگی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز محمد شاہ و نادر شاہ ایک ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ قہوہ کا وقت آگیا۔ بادشاہ نے انھیں (نواب) اشارہ کیا۔ عمدۃ الملک قہوہ کی دو پیالیاں بنا کر اور کشتی میں رکھ کر حضور میں لائے۔ لیکن سوچے کہ دو میں سے کس بادشاہ کے آگے پہلے پیالی رکھوں۔ محمد شاہ کو پیش کرتا ہوں تو قہرمانِ ایران جیتا نہ چھوڑے گا۔ اور اگر اُس کی تواضع کرتا ہوں تو اپنے آقا کی کسرِ شان ہوتی ہے۔ اور یہ امر نمک حلالی سے دور ہے۔ آخر ان دونوں شاہوں کے بیچ میں کشتی رکھ کر بہ ادب عرض کی کہ دست خانہ زاد کوتاہ شاہ ہی شاہ کی تواضع کر سکتا ہے! اس فقرے پر محمد شاہ مسکرایا۔ اور نادر نے بے ساختہ کہا کہ "محمد امیر عضب کردی، از فراست و تمیز تو خیلے خورسندم!" پھر دونوں بادشاہوں نے اپنی اپنی پیالیاں اٹھا لیں اور قہوہ نوش کرنے لگے۔

نادر کے قہر و غضب کی آگ بھی انھیں عمدۃ الملک نے بجھائی۔ دلّی میں جس روز قتلِ عام ہوا اور نادر سنہری مسجد میں آکر اور تلوار میان سے نکال کر اپنی فوج کو حملہ و غارت کا حکم دے کر وہاں بیٹھ گیا تو کہتے ہیں کہ صبح سے دوپہر تک لاکھ آدمی سے زیادہ مارا گیا؟ اور خون کا دریا بہہ گیا کسے جرأت کہ نادر پاس جائے اور رعایا کی جان بچائے۔ آخر عمدۃ الملک کمر کس کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر اس قہرمان کے سامنے آئے[۱]۔ نادر نے پوچھا "خیر باشد محمد امیر چہ میخواہی؟"۔ انھوں نے دست بستہ عرض کی کہ ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی ۔۔۔ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی!

یہ برجستہ و باموقعہ شعر سن کر نادر نرم ہوا۔ تلوار میان میں کر کے کہا کہ "خیر

---

[۱] جن انگریز مورخین نے لکھا ہے کہ اس موقعہ پر محمد شاہ نے خود آکر نادر سے معذرت کی وہ ان کے پکیڈلی سرکس (لندن کا ایک مشہور محلہ) کے کسی قہوہ خانہ کی ایک گپ ہے!
بعض ناواقفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقعہ پر نواب آصف جاہ نادر کے پاس گئے اور اُس کے آتشِ غضب کو انھوں نے سرد کیا مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ نادر کے حملہ کرنال کے وقت نواب آصف جاہ نے اُسے دو کروڑ تاوان دے کر دہلی سے لوٹا دینا چاہا تھا لیکن نواب سعادت خان برہان الملک (اودھ) نے نادر سے کہا کہ اتنی معمولی رقم تو غلام پیش کش کر سکتا ہے۔ یہ کہہ کر اور اُسے ہند کی دولت کا لالچ دلا کر دلی لے آئے۔ اُس روز سے نادر نواب آصف جاہ سے برہم تھا۔ اس لیے وہ نادر پاس جانے کی نہ جرأت کر سکتے تھے اور نہ نادر ان کی کوئی خاطر رکھ سکتا تھا۔ تذکرہ نویس تو خیر بعض مورخین تک ایسی تاریخی غلطیاں کر جاتے اور واقعات کو جانچے بغیر جو دل میں آتا ہے تحریر فرما دیتے ہیں!

بخشیدم"! شہر میں امان، امان کی منادی ہوئی اور دلّی زیادہ کشت و خون سے بچ گئی!

نواب عمدۃ الملک کی خوش مذاقی و ہر دل عزیزی نے اُس وقت کے امرا اور اہل فن کو اپنا بنا رکھا تھا۔ اور ان کا گھر اپنے دوستوں کے لیئے وقف اور اُن کی آرامگاہ تھا۔ موسیقی کے دلچسپ جلسوں کے علاوہ شعر خوانی کی صحبتیں بھی ہوتیں۔ فارسی غزلیں پڑھی اور اردو کی مشقیں دکھائی جاتیں۔ نواب عنایت خان راسخ اور نواب محمد شاکر خان شاکر (صاحبزادگان خان صادق) تک پانی پت سے شہر (دہلی) آتے اور شریک بزم ہوتے۔ نواب صفدر جنگ و نواب سالار جنگ (اودھ) کے سے امیر تک ان صحبتوں سے لطف اٹھاتے اور نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ[۵۱] بھی جب

[۵۱] نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ (والد بزرگوار نواب سید غلام حسین خاں، صاحب سیر المتاخرین) عظیم آباد کے صوبہ بھی رہے ہیں۔ نواب علی وردی خان مہابت جنگ (والی بنگالہ) سے اور نواب صاحب سے خصوصیت و قرابت بھی تھی۔ اور اس وجہ سے دہلی کے علاوہ بنگال و بہار پر بھی اُن کا خاص اثر تھا۔ نواب صاحب شاعر اور شاعر گر تھے۔ اِن کے دوہے، چیت، ساون اور ٹھمریاں بہت مشہور اور اس وقت شہر کے گلی کوچوں میں گائی جاتی تھیں۔ اردو کے یہ استاد اور عمدۃ الملکی اسکول (دہلی) کے ایک رکن رکین تھے۔ ضمیر تخلص کرتے اور غزلیں بھی فرماتے تھے۔ میر حسن نے اپنے مشہور تذکرہ کو ان کے ذکر خیر سے زینت دے کر بہ فخر اِن کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎ ہرگز یہ میرے عشق کا سر فاش نہ ہوتا+ کرتا نہ اگر آکے مرا پردہ دری آہ

عظیم آباد سے دلّی تشریف لے جاتے تو ان جلسوں میں شرکت کرتے۔ دہلی کے اُمرا میں نواب نوازش علی خاں و نواب اشرف علی خاں اور اُن کے فرزند رشید نواب فضل علی خاں فضلی (جنھوں نے ۱۱۴۵ھ میں، کربل کتھا اردو نثر میں لکھی) بھی خاص ذکر کے لائق ہیں جو عمدۃ الملک کے ہم پیالہ و ہم نوالا اور اِن بزموں کے بڑے دِلدادہ رہے ہیں۔ حضرت شاہ گلشن علی اور خواجہ ناصر عندلیب (پدر بزرگوار خواجہ میر درد) نے بھی ان جلسوں میں جائے امتیاز پائی۔ اور شاہ حاتم (مرزا رفیع سودا کے استاد) و میر ضاحک (والد بزرگوار میر حسن) کے ساتھ آنند گھن (مشہور کوی) دیوی کوی اور صورت مسر بھی اِن صحبتوں میں بیٹھے اور اُمرا کی زبان سے آشنا رہے ہیں۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے وقت کے اُستاد اور اردو کے ماہر مانے گئے ہیں۔

عمدۃ الملک کی زبان و شاعری کے اُس وقت بڑے چرچے تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۔ نواب مرحوم، اخیر میں عظیم آباد کے علاوہ زیادہ تر اپنی جاگیر، پرگنہ جیلا (صوبۂ بہار) کے مشہور قصبہ حسین آباد میں مقیم رہے اور وہیں مرحوم و مدفون ہوئے۔ قصبہ حسین آباد ان کی نسبت سے ہمیشہ باوقار رہا۔ اس قصبہ کی اردو بااعتبار تھی۔ اس خاندان کے نام لیوا رخصت ہوگئے۔ کچھ دم باقی ہیں اللہ انھیں سلامت رکھے

اُن کی یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ اردو کے اُستاد اور مجتہدِ فن تھے۔ اِن میں ذرا زبان کے انداز اور طرزِ ادا کو دیکھنا اور اپنی دو سو برس کی اردو پر نظر کرنا۔

غزل

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
منھ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغ غلامی سے ترے طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم
اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانند شرر جب کر چلے برباد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم ۱

یہ تھا اُس وقت کے اُمرا کا روزمرہ اور یہ تھی وہ ٹکسالی اردو جو ہمہ شما کے

گھروں میں نہیں بلکہ ان امیروں کے محلوں میں پلی اور وہاں سے نکل کر ہمارے شعرا کے مُنھ میں پڑی۔ نوّاب کی ایک غزل اور سن لو،

دھنو اور داد دو۔

غزل

کیوں بلایا بھیڑ میں مجھ سے یہ نادانی ہوئی | دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی!
کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات | کشتیٔ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز | ٹوٹتے ہی دل کے مجکو سخت حیرانی ہوئی
لاش میری دیکھ کر مقتل میں یوں کہنے لگے | کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہی پہچانی ہوئی

واہ رے زبان!

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو،
دوست داروں کی محبت دشمنِ جانی ہوئی

آج کون کہہ سکتا ہے کہ یہ محمد شاہی اُردو اور وہ زبان ہے کہ اب بھی جوان ہے! افسوس کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے اپنے اُمرا کو چھوڑ کر صرف اُن شعرا کو پکڑ لیا جو اُس وقت کسی وجہ سے ذرا ممتاز نظر آتے تھے۔ مگر یہ وہی ہیں جنھوں نے اُن امیروں کے گھروں میں پرورش پائی اور وہاں سے زبان سیکھ کر نکلے اور اپنی آواز بلند

کرتے رہے! اور تو اور ہمارے تذکروں میں میاں ولی (دکھنی) اُردو غزلوں کے باوا آدم کہے جاتے اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے ہیں۔ مگر ایک یہ ولی کیا کسی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں دکھائی۔ حق یوں ہے کہ ولی، محمد شاہ کے شروع زمانہ میں اپنا دیوان بغل میں دبائے، کھوٹے کھرے کی شناخت کے لیئے دکھن سے دِلّی کے ٹکسال گھر تک آئے اور اردو سیکھنے لگے۔ ولی بچارے کو وہ زبان کہاں نصیب جو اردوئے معلّیٰ کہی جاتی اور قلعۂ معلّیٰ اور دہلی کے اُمرا کے محلوں سے ابھی باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ (ولی) تو وہی زبان بولتے تھے جو اُس وقت دکھن میں رائج اور نربدا (دریا) کے اُدھر ہی تاپتی[۱] رہی۔ ہاں۔ ولی نے شعرائے ایران کی طرح اپنا دیوان بے شک ترتیب دیا۔ اس میں ضرور پہل کی۔ یہ طریقہ بھایا اور پھر شعرائے دہلی نے اس میں اُن کی تقلید شروع کر دی

نواب کی اِن غزلوں نے اُس وقت کی زبان کو بتایا کہ اب اس میں خیالات و جذبات کے بیان کا کتنا مادہ آچکا تھا۔ مگر اس لحاظ سے کہ ابھی

---

[۱] دکھن میں نربدا و تاپتی دو مشہور دریا ہیں۔

وہ نارس تھی اور کسی قاعدہ کے ساتھ اوروں تک پہونچی نہ تھی، اس کے پختہ اور باقاعدہ بنانے کی فکر ہوئی۔ عمدۃ الملک نے، اور امرا کے مشورہ سے، دہلی میں ایک اردو انجمن قائم کی۔ اس کے جلسے ہوتے، زبان کے مسئلے چھڑتے، چیزوں کے اردو نام رکھے جاتے، لفظوں اور محاوروں پر بحثیں ہوتیں اور بڑے رگڑوں جھگڑوں اور چھان بین کے بعد، انجمن کے دفتر میں وہ تحقیق شدہ الفاظ و محاورات قلمبند ہوکر محفوظ کئے جاتے۔ اور بقول صاحب سیر المتاخرین، ان کی نقلیں ہند کے امرا اور رؤسا[1] پاس بھیج دی جاتیں اور وہ اس کی تقلید کو فخر جانتے اور اپنی اپنی جگہ اُن لفظوں اور محاوروں کو پھیلاتے۔

یہ تھی وہ انجمن اور یہ تھا وہ مدرسہ جہاں طفل اُردو کی بسم اللہ ہوئی اور یہ تھا وہ مکتب جہاں ہمارا ریختہ، پختہ ہوا۔ اور یہ تھا وہ اسکول جہاں شاہ حاتم و میر ضاحک اور دیوی کوی کے سے زبان دانوں نے تعلیم پائی اور پھر اُس کی خدمت میں اپنی جان کھپائی۔ عمدۃ الملک کا

[1] بنگال و بہار اور خصوصاً عظیم آباد میں عمدۃ الملکی مدرسہ کی یہ زبان اسی طریقہ سے پھیلی اور وہاں عام ہوئی۔

اس زبان پر یہ احسان بھلایا نہیں جا سکتا کہ اُن کی تن دہی سے اُردو، اُردوئے معلّٰی بن کر اطراف ہند میں پھیلی اور وہ اُمرا ؤ رؤسا کے مُنھ لگ کر پختہ اور شُستہ و رُفتہ ہو گئی!

افسوس کہ محمد شاہ کے ہاتھوں، نواب کا انجام بخیر نہ ہوا۔ وہ کچھ اور جیتے تو نہ معلوم اردو کو اور کیا رونق دیتے۔ نواب ایک دن، حسبِ معمول دربار کے بعد تخلیہ میں محمد شاہ سے کچھ ضروری باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو میں ذرا دیر ہوئی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ "نواب جو کہنا ہے اب کل پر اٹھا رکھو۔" انھوں نے عرض کی کہ "پیر و مرشد یہ ملکی و ضروری باتیں ہیں آج فیصلہ ہونا چاہیئے۔" یہ کہہ کر گفتگو شروع کی۔ محمد شاہ نے پھر کہا کہ "خیر قصّہ مختصر کرو۔" یہ جواب دینا چاہتے تھے کہ شاہی خواجہ سرا جو اُس وقت حاضر تھا کڑک کر بولا کہ "نواب شاہی حکم سنو۔" عمدۃ الملک کو برا لگا۔ خواجہ سرا سے کہا کہ "شاہوں اور وزیروں کے معاملات میں خواجہ سراؤں اور غلاموں کو کیا دخل۔ خموش باش!" یہ کہہ کر بادشاہ سے عرض کی کہ "کل سے قلعہ میں غلام کا پہرا رہے گا۔ اور بے ادبوں کو دور رہنا ہوگا۔" محمد شاہ نے گھبرا کر کہا کہ "اچھا یہی ہوگا۔" یہ آداب بجا لا کر رخصت ہوئے

تو بادشاہ نے اُس خواجہ سرا سے فرمایا کہ "کل سے ہم گویا نظر بند ہیں۔ محمد امیر خاں معمولی شخص نہیں اور نیری بھی خیر نہیں۔" اُس نے عرض کی کہ "حضور اس معاملہ کو غلام پر چھوڑ دیں۔ فکر ہو جائے گی۔"

دوسرے روز حسب معمول عمدۃ الملک دربار گئے تو اپنے سپاہی اور پہرے دار ساتھ تھے۔ پالکی سے اُترے اور حسب دستور رفیقوں اور جاں نثاروں کے حلقہ میں چلے۔ آداب گاہ تک پہونچے۔ رفقا الگ ہو گئے۔ یہ چند ہی قدم بڑھے تھے کہ اُس ناشدنی خواجہ سرا کے ایک لگے ہوئے آدمی نے جھپٹ کر جمدھر مارا۔ نواب بیہوش گرے۔ زخم کاری تھا، جاں بر نہ ہو سکے دربار میں تہلکہ اور شہر میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ بمشکل لاش اٹھائی اور گھر لائی گئی۔ شاہان تیموریہ کے دستور کے موافق فوراً مکان پر قُرقی آئی اور لاکھوں کا اثاثہ[1] اُٹھ کر ضبط سرکار ہو گیا۔ مرحوم کی چیزوں میں اردو کا وہ دفتر بھی تھا جسے نواب جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ صفدر جنگ (اودھ) اُس وقت دلّی میں تھے۔ بہ ہزار خرابی اُنھوں نے اُس دفتر کو سمیٹا اور اپنے اُس شہید دوست و رفیق امیر کی اُس یادگار کو جان کے برابر رکھا۔ کچھ

---

[1] سیر المتاخرین و تذکرۂ شعرائے اردو از منشی کریم الدین پانی پتی۔

دن بعد پھر وہ انجمن فیض آباد میں قائم ہوئی اور میر ضاحک کو بھی اس کے دفتر میں معقول جگہ دی گئی۔ اردو کا ایسا چرچا مدتوں وہاں بھی رہا اور نواب ابراہیم علی خاں صاحب گلزار ابراہیمی) فرماتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ اور بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) تک، اردو کا وہ مکتب اودھ میں بھی کھلا رہا۔ عمدۃ الملک کی ایسی شہادت کا ملک نے بجید غم کیا۔ مدتوں اُن کے چرچے اور زبانوں پر اُن کے فسانے رہے۔ شاعر نے غم عمدہ (۱۱۵۹ھ) سے تاریخ شہادت نکالی اور وہ زبان زد ہوگئی!

محمد شاہ اور اردوئے معلّٰی

فرخ سیر کے بعد جب روشن اختر[1] سلیم گڑھ کے حبس سے نکال کر دہلی کے تخت پر محمد شاہ بنا کر بٹھایا گیا تو کسے امید تھی کہ یہ بیمار شہزادہ

---

[1] سادات (سید حسین علی خاں و سید عبداللہ خاں) نے جس جاں فشانی سے فرخ سیر کو اُس کا آبائی تخت دلوایا اُس کا ذکر فرخ سیر کے حال میں گذر چکا۔ اس خدمت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ اور سلطنت اُن کے قبضہ سے باہر نہ ہوں۔ چند دن ایسا ہی ہوا۔ لیکن فرخ سیر کو ان وزرا (سادات) کا ایسا در خور گوارا نہ تھا۔ اُن کے احسانوں کو بھول کر اُس نے اُن کی مخالفت شروع کی۔ امیر الامرا (سید حسین علی خاں) کو مرہٹوں کے مقابلہ کے لیئے دکھن بھیج کر انھیں دار السلطنت سے دور کر دیا۔ اور پھر اُن کے خلاف سازش کرنے لگا۔ سید حسین علی خاں با خبر ہوئے اور مرہٹوں سے فیصلہ کر کے

جسے مدتوں باہر کی ہوا نہ لگی ایک دن بھی اُس تاج کے بار کو اٹھا سکے گا
جسے اس کے بزرگ اب تک سنبھالے رہے لیکن اُس نے اپنی اٹھائیس[لہ] سال کی

[لہ] محمد شاہ سنہ ۱۷۲۰ء میں تخت نشین ہوا اور سنہ ۱۷۴۸ء میں فوت ہوا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٣ - دلی کی طرف بڑھے - فرخ سیر مقابلہ کے لیئے نکلا - لڑائی ہوئی اور اُس نے شکست کھائی - وہ قتل ہوا اور تخت خالی ہوگیا - ان سادات کو سلطنت کی ہوس ہوتی تو یہی موقعہ تھا - بادشاہ بن جاتے - اور حکمرانی کرتے مگر جس تخت کو چوم چکے تھے اُس پر پاؤں کیا رکھتے - اُنھوں نے سنہ ۱۷۱۹ء میں رفیع الدرجات ایک شاہزادہ کو بادشاہ بنایا مگر وہ ایک سال کے اندر مرگیا - پھر ایک دوسرے شہزادے رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا - چند دن بعد وہ بھی جان بحق ہوا - آخر روشن اختر (محمد شاہ) کا ستارا چمکا اور سادات نے اُسے (سنہ ۱۷۲۰ء) شاہِ ہند بنایا
محمد شاہ کو بادشاہ بنا کر سادات بادشاہ گر بنے - اب پھر سلطنت کی باگ اُن کے ہاتھ میں تھی - آخر فرخ سیر کی طرح محمد شاہ سے بھی اختلاف شروع ہوا - امیر الامرا اور قطب الملک (سید عبداللہ) دونوں شاہی ارادوں کو سمجھے - بادشاہ سے صاف کہا کہ "ہمارے گھر سے اگر وزارت گئی تو آپ کے خاندان سے بادشاہت بھی گئی" صلح و آشتی کی تدبیریں کی گئیں سب اُلٹی پڑیں - ایک اجنبی تاتاری بلایا گیا نواب (امیر الامرا) دربار سے پالکی میں گھر جارہے تھے - سواری روک کر اُس نے ایک عرضی پیش کی - یہ اُسے پڑھ رہے تھے کہ اُس ظالم نے موقعہ پاکر پیٹ میں چھرا مارا - اور نواب کا کام تمام ہوگیا - قطب الملک کو بھائی کی ایسی شہادت کی خبر ملی تو طیش میں نکلے - شاہی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی - اُمرا بیچ میں آئے - اور لڑائی موقوف ہوئی - اِن واقعات اور محمد شاہ کی بے ترکیبیوں کا اُمرا پر سخت اثر پڑا - نظام الملک آصف جاہ نے حکومت کے یہ انداز دیکھ کر دکھن پر آخر قبضہ کرلیا - اور نواب صفدر جنگ نے بادشاہ سے ناراض ہوکر اودھ کو ایک مستقل صوبہ بنالیا - ہماری موجودہ انگریزی درسی تاریخیں اصلی واقعات سے دور نظر آتی ہیں - ان کے مصنفین یا تو انگریز ہیں یا انگریزی ذلہ خوار - سبب اور نتیجہ جو تاریخ کی جان ہے اُسے بھول کر جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں - سادات کو بغیر سمجھے بُرا کہہ دینے، صفدر جنگ کو نمک حرام لقب دینے، اور آصف جاہ کو بدنام کرنے میں نہیں چوکتے! یہی تاریخیں مدرسوں اور اسکولوں میں رائج ہیں جس ملک کے افسرانِ تعلیم تاریخ سے بے بہرہ ہوں وہاں یہی ہوگا - ہمارے بچے ایسی ہی تاریخیں پڑھیں گے اور گمراہ ہونگے

حکومت میں دکھا دیا کہ مُغلی خون اُس کی رگوں میں اب تک دوڑ رہا اور ٹھنڈا نہیں ہوا ہے!

اس وقت دنیا کے اور حکمرانوں کی طرح اِن مغلوں میں بھی کتنی ہی کمزوریاں کیوں نہ ہوں مگر انصاف یہ ہے کہ وہ ہر حال میں علم و فن کے حامی بلکہ سرپرست رہے ہے۔ اور بابر سے لے کر ظفر شاہ (آخیر بادشاہ دہلی) تک یہ رنگ اُن کی سلطنت میں نمایاں اور ادب کا شوق، زبانوں سے الفت اور رعایا کی بھاکھا پر رغبت اس خاندان کا آئین رہا ہے۔ محمد شاہ بھی اس معاملہ میں اپنے بزرگوں کا مقلد اور اُن کی بات کا نباہنے والا نظر آتا ہے۔

یہ اسی بادشاہ کی خوش مذاقی تھی کہ موسیقی کا سا فن جو عالمگیر کے وقت میں مر چکا تھا جی گیا۔ بے خبر جو چاہیں کہیں مگر باخبر یہی کہتے چلے آئے ہیں اور یہی کہتے چلے جائیں گے کہ "موسیقی آواز فطرت کو بلند کرتی ہے!" اس لیئے جس نے اس کا پاس کیا اُس نے فطرت کا ساتھ دیا۔ اور اس لیئے محمد شاہ کی تعریف کی جائے گی کہ اُس کی توجہ سے وہ فن جو ہند کا ایک قیمتی تحفہ ہے یہاں کے اور فنون کی طرح بے آواز نہ ہونے پایا۔

اِس ملک کا دوسرا نادِر تحفہ (علمِ) نجوم ہے۔ عرصہ سے وہ بھی گردش میں تھا مگر محمد شاہی دَور میں اِس کے دِن بھی پھرے اور جے سنگھ کے جوتشی کی نگرانی میں شہر (دہلی) سے باہر بہت جلد ایک ایسا رصد خانہ (آبزرویٹری) تیار ہو گیا۔ جس کی شہرت دور دور پہونچی۔ اور آخر فرانس کے مشہور منجم دی لاہائر نے بھی بہ شوق جسے دیکھا اور اپنی زمین پر اِس آسمانی نقشہ کا چربہ کھینچا۔ یہ رصد خانہ وہی جنتر منتر ہے جو آج بھی مغلئی دہلی اور انگریزی دلّی کے بیچ میں کھڑا محمد شاہ کے وقت اور جے سنگھ کے علم و محنت کو یاد دلا رہا ہے۔ اور یہ وہی جے سنگھ ہیں جو راجہ جے سنگھ بن کر شاہ جہاں آباد (دہلی) سے اپنی ریاست پر گئے اور وہاں جے پور کا سا خوبصورت شہر بنا کر اپنی یہ دوسری یادگار چھوڑ گئے۔

اس زمین کی تیسری انمول پیداوار وہ حکمت یعنی طبابت ہے جس کا شہرا دور دور پہونچا۔ ایک دھنتر (طبیب) ہی نہیں یہاں ویسے بے گنتی بید پیدا ہوئے جو دوسرے ملکوں میں بھی نام کر آئے۔ ہارون و مامون تک کے دربار میں جہاں یہودی زور سے یونانی حکمت چل رہی تھی، ہندی طبیب بھی اپنی خاص جگہ بنائے رہے ہے۔ اور ایک اگر دہا وید کے

ہی نہیں جو سکندر لودھی کے حکم سے فارسی جامہ پہن کر طبِ سکندری کی شکل میں پیش ہوئی، یہاں ویسی ہزار تصنیفیں ہوئیں اور ملک میں پھیل کر جانوں کو بچاتی رہیں۔ مگر زمانہ سے ہماری یہ دیسی طب، جالینوسی حکمت اور ابن سینا (شیخ الرئیس بو علی سینا) کے نسخوں کے آگے دقیانوسی اور گھاس پھوس سمجھی جا رہی اور ایرانی طبیب ہمارے شاہوں کے شافی ہو رہے تھے۔ ان کی جگہ فرنگی ڈاکٹروں نے لی۔ شاہ جہان و عالمگیر کے وقت میں ڈاکٹر برنیر[ا] (فرنچ) مدتوں یہاں رہ کر ہم کو لوٹتا اور اپنا گھر بھرتا رہا۔ شاہ جہانی بوٹن[۲] اور فرخ سیری ہملٹن[۳] کو کون نہیں جانتا جن کی چرسا بھر زمین نے آخر سارا ملک

[ا] ڈاکٹر برنیر شاہ جہاں کے وقت میں یہاں آیا اور بارہ برس دلی میں بھاڑ جھونکتا رہا۔ اس نے نواب دانشمند خاں وزیر و استاد نعمت خان عالی کی سرکار میں نوکری کر لی تھی۔ نواب کی توجہ سے آخر اس کی ڈاکٹری چمکی۔ فرانس جا کر اس نے اپنا سفرنامہ لکھا۔ فرنگیوں کو اس سفرنامہ پر بڑا اعتبار ہے اور انگریزوں کی تاریخ ہند میں ہمیشہ اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

[۲] یہ وہی (ڈاکٹر) بوٹن ہیں جنھوں نے ۱۶۳۶ء میں ایک شہزادی کو اچھا کرنے کے صلہ میں شاہ جہاں سے کمپنی (ایسٹ انڈیا) کے لیئے تجارتی حقوق حاصل کیئے اور بالاسور اور ہوگلی میں انگریزی فیکٹریاں بنائی گئیں۔

[۳] یہ ہملٹن وہی ڈاکٹر ہملٹن ہیں جنھوں نے فرخ سیر کے علاج کے سلسلہ میں کلکتہ کے قریب انگریزوں کے لیئے گاؤں خریدنے کی اجازت پائی۔ اور جب سے بنگالہ میں انگریزی اقتدار قائم ہو گیا۔ ہماری زبان میں چرسہ بھر زمین لینے کا سا محاورہ انھیں کی بدولت ایجاد ہو گیا۔

دبالیا اور وہ آج تک نہیں چھوٹا! غرض جبکہ بدیسی طب یوں ہمارا خون چوس ہی تھی کہ محمد شاہ کے اقبال سے یہاں حکیم علوی خاں پیدا ہوئے۔ یہ وہ ہندی طبیب ہیں جنھوں نے ملک کے مزاج کو سمجھ کر اس زمین کی جڑی بوٹیوں سے کام نکالا۔ اور اس فن طبابت کو غلامی سے آزاد کرادیا۔ یہ شاہی طبیب اور محمد شاہ کے ایسے مزاج شناس تھے کہ بادشاہ کو ان کے بغیر دم بھر قرار نہ تھا۔ اور یہ وہی طبیب حاذق ہیں جنھیں نادر شاہ، تخت طاؤس اور کوہِ نور کے ساتھ ہم سے چھین کر لے گیا! ایسے ہزار تخت اور روپے لاکھ کوہِ نور جاتے، پرواہ نہ تھی۔ مگر علوی خاں کا سا ہیرا پھر کسی کان سے نکل نہیں سکتا۔ اور اس لیئے ہمارے ہاتھ سے اُن کے یوں جانے کا غم دور نہیں ہوسکتا! محمد شاہ کی توجہ سے ہندی طبابت کی نئی زندگی اور پھر اُس کی ترقی کیونکر بھولی جاسکتی ہے؟۔

محمد شاہ کا زمانہ رنگا رنگ تصویروں کا نگارخانہ بنا رہا ہے۔ اس مرقع میں نادری تصویر بھی دیدلی ہے۔ اور چونکہ اُس کے سنوارنے میں ہماری زبان کا مُوقلم بھی شریک رہا ہے اس لیئے اُس کا دولفظی بیان بے جگہ نہ ہوگا۔

اُردو کے اکثر لفظوں کو نادری واقعات سے نسبت ہے اور وہ

ہمارا محاورہ ہو کر ایک مزے دار تاریخ بن گئے ہیں۔ نادری، نادر شاہی، نادری حکم اور نادر گردی اور پھر غمزۂ نادر جیسے ؎

قتلِ عام است درین جہان آباد + آخر این غمزۂ تو نادر نیست!

یا صورتِ نادر جیسے ؎ شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت، کے

سے الفاظ اور فقرے جن میں کچھ مرے اور کچھ جیتے رہے، اسی نادری سانحے سے پیدا ہوئے اور وہ اس واقعہ کی خبر دیتے اور اپنی تاریخ بتاتے ہیں اس لیئے ایسے لفظوں اور محاوروں کو سمجھنے اور انھیں موقعہ پر برتنے کے خواہشمند جب تک تاریخ کے ورق نہ اُلٹیں اپنی آرزو پوری نہیں کر سکتے پھر اس قصہ میں ہماری زبان کا کچھ حصہ بھی ہے اس لیئے وہ اور مزے دار ہو گیا۔ اس کی ایک چھوٹی سی روداد سنو اور اپنی اُردو کے بڑھتے ہوئے زور پر نظر کرو۔

نادر، قلعۂ معلیٰ میں شاہی مہمان تھا کہ ایک دن شہر کے بے فکروں اور بھنگیڑیوں نے بیٹھے کر اُڑا دی کہ " واہ رے محمد شاہ پیا، آخر بدلہ لیا۔ قلماقنیوں[1] کو ملا کر نادر کا کام تمام ہی کرا دیا " یہ گپ آگ کی طرح

[1] قلماقنیاں اور اردا بیگنیاں یہ تاتاری دتر کی ہتھیار بند عورتیں قلعہ کے محلوں میں پہرا دیتی تھیں

شہر میں پھیلی اور غضب کے شعلے روشن و بلند ہوگئے۔ بدمعاشوں کی بن آئی اور نہتھے قزلباشوں پر آفت آئی۔ نادری حکم سے اس کے فوجی بے ہتھیار بے تکلف شہر میں گھومتے اور سیر کرتے پھرتے تھے۔ اس خبر نے نامردوں کو بھی اُس وقت مرد بنا دیا۔ اور بچارے مُغل بیٹے بلکہ قتل ہونے لگے۔ آگے ایک قزلباش ہے تو پیچھے دس بانکے[1] اور بیس شہدے "لینا لینا آغا جانے نہ پائے" کی آواز گونج رہی اور بے گناہ مہمانوں کے سروں پر تلواروں کا مینہ برسا رہی ہے! بھاگتے رستہ نہیں ملتا۔ نادری حکم کے خلاف بھی نہیں ہو سکتا کہ پلٹ کر ہاتھ پیروں ہی سے کام لیں اور جان بچائیں۔ غریب کیا کریں؟۔ اس ہنگامہ میں ایک آغا چند ظالموں میں گھرا، بھاگا، نزدیک ایک گھر تھا اُس میں گھسا۔ عورتیں گھبرائیں۔ اس نے اشارہ کیا کہ ڈرو نہیں۔ ایک لڑکی کھڑی تھی اُس کی چادر چھین، چکی پاس بیٹھ آپ اُسے گھمانے لگے۔ اتنے میں وہ ظالم بھی سر پر آموجود ہوئے۔ آغا سخت گھبرائے، لجاجت کے لہجہ میں فرمانے لگے۔ بابا مغل[2] چغل نیستم

[1] محمد شاہی دور کے شہدے اور بانکے مشہور ہیں۔
[2] اُس وقت کی ایسی بہت سی نقلیں ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آئی ہیں۔

بامن کی بیتی بیتی گندم پیتا ہے" اس پر سب ہنس پڑے اور آغا کی جان بچ گئی۔ نادر کو یہاں آئے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ یہ سانحہ گذرا۔ زبان کے زور اور اس کی گھلاوٹ ملاوٹ کو دیکھنا کہ ایک مغل بچہ پر کس طرح قبضہ کرتی اور اس سے کیسا ایکٹ کرا دیتی ہے!

نادر تک یہ خبر پہونچی تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر اس وقت خموش رہا۔ دوسرے دن پو پھٹتے تلوار لے شہر کی سنہری مسجد میں آ بیٹھا، اور اپنے سپاہیوں کو بدلہ لینے اور قتلِ عام کا نادری حکم دے دیا!

محمد شاہ کی جوانی نظر بندی میں گذری اس لیئے گو وہ اپنے دادا معظم کی سی تعلیم و تربیت نہ پا سکا۔ مگر آخر تیمور بچہ تھا، علم و ہنر اس کی میراث اور خوش مذاقی اس کا حصہ تھا۔ اِن کا جلوہ کب تک نہ ہوتا۔ پھر نواب انجام کے سے فرزانہ ادیب اور اردو کے ایسے سرپرست کی صحبت، اپنی اس مادری و ملکی زبان کی خدمت کیونکر نہ کرتا۔ تاریخیں اور تذکرے شاہد ہیں کہ بھاشا کا وہ عالم اور اس میں شعر کہتا تھا۔ اس کا بارہ ماسہ اس کی رعایا پروری اور ملکی زبان کی قدر و الفت کا گواہ ہے۔ اپنے بزرگوں کی طرح اردو کو بھی اس نے منھ لگایا۔ اور اس زبان کی

پرورش میں شاہانہ حصہ لیتا رہا۔ بادشاہ کا یہ ایک شعر مشہور ہے جو اُس کی زبان و مذاق کی خبر دیتا ہے ؎

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی ؛ دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گذری کا

آنند گھن کوی اُس کا خاص ملازم اور دیبوی کوی (امیر خانی) کا وہ قدردان و مربّی تھا۔ عالم، فیض، اکرم اور غلام نبی کے سے ہندی اُردو شعرا محمد شاہی دور کے روشن اختر اور انور خاں وصورت مسّر کے سے زبان آور بھی مثمن برج[1] ہی کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ محمد معظم فیض جن کی فارسی لیلاوتی (ترجمہ از سنسکرت) مشہور ہے۔ اور رس خاں، علی خاں، شیخ نبی، امیر احمد، تاج خاں اور پیرزادی بی بی بھی اسی نادر گردی کے تلاطم میں اُٹھے اور دل سنبھال کر اپنی شاہی زبان اُور اردوئے معلّٰی کی خدمت کرتے رہے۔

محمد شاہ کا اردو پرست زمانہ اس زبان کی پہلی نثر کے لیئے بھی ممتا اور یادگار رہے گا فضلی نے اسی بادشاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ میں کربل کتھا لکھ کر نثر اردو کی بنیاد بھی ڈال دی اور اپنے اخلاف کے لیئے ایک شاہ راہ کھول دی۔ فرخ سیر و محمد شاہ کے زمانہ کی

---

[1] قلعۂ معلّٰی کی ایک بارادری کا نام مثمن برج ہے جو شاہوں کی نشست گاہ تھی۔

یک رخی تصویر دیکھنے والے اس کے دوسرے رُخ پر بھی ذرا نظر ڈالیں اور ان دونوں بادشاہوں کو دعائے خیر سے یاد کرکے اپنا فرض ادا کریں!

اُردوئے معلّٰی کی پہلی نثر

زبانوں کے بڑھنے گھٹنے میں مذہب و سیاست نے بڑے کام کیئے ہیں۔ آریوں، فارسیوں اور تازیوں کے حال میں اس کا مفصل ذکر آچکا۔ اور ملکوں کی نسبت ہند، ادب اور خصوصاً نظم کا زیادہ شوقین رہا ہے۔ اس لیئے شروع سے یہاں کے دھرموں کا سنکھ بھی اُسی (نظم) سریلی آواز میں پھنکتا رہا۔ مسلمان بھی نظم پر فدا رہے ہیں اس ملک میں جب اُنھوں نے اپنی مذہبی آواز پھیلانا چاہی تو نظم ہی کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ پنجاب اور دکھن کے پیشواؤں نے اِس میں پہل کی۔ بھاشا، دکھنی اردو اور پنجابی اُردو میں حمد و نعت، منقبت، نوحے اور مرثیئے نظم ہوئے۔ اور وہ زبانوں اور گلوں کے رستوں سے نکل کر دلوں کو گرماتے رہے۔ لیکن بہادر شاہ

(اول) کے وقت تک نثر کا چرچہ سننے میں نہیں آیا۔ یا یوں کہو کہ
اردوئے معلیٰ میں نثر کی کوئی مستقل چیز اُس زمانہ تک لکھی ہی نہ
گئی۔ ہاں فرّخ سیر کے عہد میں اس طرف بھی توجہ ہوئی اور اس
میں بھی وہی مذہبی لے شریک رہی۔

دکھنی یعنی قطب شاہی شہزادے اور امیر زادے اُدھر سے
اور چیزوں کے ساتھ محرّم کی مجلس بھی اپنے ساتھ ادھر لائے
اور وہ یہاں رواج پا گئی۔ اِن مجلسوں میں یا تو دکھنی اُردو کے
مرثیے پڑھے جاتے تھے یا فارسی نوحے۔ واقعہ خوانی بھی فارسی
ہی میں ہوتی اور ان کلاموں پر مجلس تمام کر دی جاتی۔

مرد تو خیر مگر ہماری عورتیں اب نہ فارسی سمجھتی تھیں اور نہ
دکھنی۔ وہ ان بیانوں سے کیا فائدہ اٹھاتیں۔ اِس کی شکایت عام
تھی۔ اُس وقت کے امیروں کو آخر اس طرف بھی متوجہ ہونا پڑا۔
نواب اشرف علی خاں دہلوی (فرّخ سیری) نے اپنے لئیق فرزند
نواب فضل علی خاں فضلی سے فرمائش کی کہ کربلا کا حال اُردو میں
لکھ دو کہ عوام اور خصوصاً عورتیں بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ اِس

حکم کی تعمیل ہوئی اور نواب فضلی نے بڑی محنت سے اپنی وہ مجلس جس کا اصل نام کربل کتھا ہے، تحریر کی۔ یہ کتھا محمد شاہ بادشاہ کے عہد اور ۱۱۴۵ھ میں تمام ہوئی۔ فضلی اس کے دیباچہ میں کہتے ہیں کہ:۔

" اُن ایام میں میری عُمر بائیس برس کی تھی۔ اس کا سبب تالیف کا "

" یہ تھا کہ قبلۂ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے نواب مستطاب معلی القاب "

" اعنی نواب بابا ام نواب اشرف علی خاں سلمہ اللہ الملک المنّان "

" ہر سال تعزیہ ابو عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بہ خلوص نیّت "

" اندرون محل مخفی بموجب حدیث شریف کہ۔ التّقیۃ دینی "

" و دین آبائی والتقیۃ جنتہ، بوجہ احسن بجا لاتے تھے "

" اور بندہ حقیر پُر تقصیر حسب الارشاد اُس قبلہ گاہ کے روضۃ الشہدا "

" کا خلاصہ کہ سب نکتہ سنجانِ مناقب شاہِ لا فتیٰ لئے اور سب "

" دقیقہ فہمانِ مصائب سید الشہدا لئے واقعۂ شہادت شاہ کربلا "

" کا اُس میں لکھا ہے سناتا تھا لیکن معنی اُس کے عورتوں کی سمجھ "

" میں نہ آتے تھے۔ اور فقرات پر سوز و گداز اس کتاب مذکورہ "

" کے بہ سبب لغات فارسی اُن کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات "

بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس
جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے
بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح
من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سے بے سمجھوں کو ان سمجھا کر رُلاوے
مجھ احقر احقر کی خاطر میں گذرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا بہ رنگینی عبارات
اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجیے تو
بموجب اس کلام بانظام کے من بکی علی الحسین او ابکا
و تباکا وجبت لہ الجنۃ۔ بڑا صواب لیجیے (ترجمہ: جو
شخص رویا اوپر حسین کے یا جس نے رلایا، یا رونے والے کی صورت بنائی اسکے
واسطے جنت واجب ہو گی) کیونکہ اس فائدۂ سبحانی اور اس مائدۂ
ربانی سے زن و مرد اور پیر و جوان، خواندہ و ناخواندہ اور خرد و کلان
کو بہرۂ فاضل اور نصیبۂ کامل ہووے اور ہر ایک بے خبر اس درد
پر سوز اور اس خبر غم اندوز کو سن کر اور سمجھ کر رووے۔ پھر دل میں یہ
گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہووے
شامل۔ کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل

؎ صورت پذیرنہ ہوئے اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے ۔ ؎

؎ لہذا ، پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع ۔ اور اب تک ؎

؎ ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع ؎

؎ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبیر میں ؎

؎ سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی گلشن ؎

؎ افکار پر اہتزاز میں آ ، یہ بات آئینۂ خاطر میں مونہہ دکھلائے کہ یہ فکر ؎

؎ عظیم بغیر امداد ارواح مقدس حسین علیہ السلام ، حسب خواہش محبوں ؎

؎ کے سرانجام نہ پاوے ۔ چوں ذکر حسنین علیہما السلام کی مدد کا ذہن ؎

؎ نشین ہوا وہیں دل کو تقویت ہوئی ۔ پھر خاطر میں گذرا کہ قادر حقیقی ؎

؎ اور خالق تحقیقی نے ذات انسانی کو ایسی قدرت کرامت کی ہے کہ ؎

؎ جیسے کام پر طبیعت اور توجہ کو مصروف رکھے البتہ معطل و موقوف ؎

؎ نہ رہے اور انصرام کو پہونچے ۔ اے دل بحکم السعی منّی والاتمام ؎

؎ من اللہ اس سعادت عظمیٰ اور اس عبادت کبریٰ کو خاطر امید میں ؎

؎ دھر ۔ اور اس بیابان فصاحت و بلاغت کو ساتھ تائید عنایات ؎

؎ صمدی کے طے کر ۔ اور بہ مقتضائے حدیث الدّال علی الخیر ؎

" کفا علے، امید صواب دھرے
" ایک رات بعد کتاب خوانی اور سینہ زنی کے ایک فاتحہ مخفی اس "
" کام بانظام کے لیئے پڑھا۔ وہیں برکت اور یمنت فاتحہ سے مجھ "
" بے دل کے دل کو ن انشراحِ اور افتتاح ظاہر ہوا۔ پھر ساتھ نظر "
" تامل اور تفکر کے مطالعہ 'لا تتحرک ذرۃ الّا باذنِ اللہ "
" کا کر سو گیا۔ اسی رات واقعہ میں دیکھتا ہوں کہ گویا ایک طرف "
" بمعہ اخوان ذی شان و دوستان بہتر از جان سیر کو جاتا ہوں۔ "
" مابین راہ کے ایک شخص اجنبی نے کہا کہ۔ اوّل روضہ مقدس "
" حسنین علیہما السّلام کی زیارت کرے۔ میں بہ خواہش اتم اور بہ خوشی اکم "
" اس روضہ منورہ میں گیا" (اقتباس از دیباچۂ کربل کتھا۔ قلمی)

بعد کو نواب فضلی اپنے اس خواب کا مفصّل حال لکھتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کی زیارت انھیں نصیب ہوتی ہے۔ حضرت، ان کے ساتھ بہ کمال التفات پیش آتے اور نرگس کے گلدستے عنایت فرماتے ہیں۔ فضلی یہ تحفہ پاکر شادی مرگ ہو جاتے ہیں۔ انھیں رخصت ہونے کی اجازت ملتی ہے اور یہ ایک خاص پالکی میں بیٹھ کر گھر آتے ہیں۔ اتنے میں ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس خواب کو وہ ایک بشارت سمجھتے اور پھر اپنی کربل کتھا کے لکھنے پر مستعد ہو جاتے اور تحریر کرتے ہیں۔ کہ :-

"یہ رسالہ اوپر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اس کتاب کی تاریخ تصنیف یہ ہے :-

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف — بہر کسب صواب و فیضِ بشر
جا لہا تاریخ اس کی، بولے سروش — شیعوں کی نجات کا، مظہر

لفظِ مظہر سے تاریخ نکالی ہے جس کے ۱۱۴۵ھ ہوتے ہیں۔ یہ زمانہ محمد شاہ بادشاہ کا ہے۔ بعد کو اس رسالہ پر انھوں نے نظر ثانی کی۔ کہتے ہیں کہ :-

"اور اب کے نظر ثانی کر کمیت و کیفیت مضامین و ہندی اصطلاحات و استعارات رنگیں اصلاح دیا اس تاریخ نے صفحۂ دل پر جلوہ دیا

ہر کس از من کند بہ نیکی یاد — بہ جہاں نامش ہم بہ نیکی باد
۱۱۹۱ھ

نواب نے اپنی اس تصنیف کے متعلق بہ فخر دعویٰ کیا ہے کہ "پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور ہندی نثر نہیں ہوئی مستمع!" اُن کا یہ دعویٰ درست ہے۔ اس لیئے کہ اُن سے پہلے اگر کسی نے

اُردو نثر میں کچھ لکھا بھی ہو تو اُس زبان میں جو ٹکسال باہر تھی۔ اور اُسے اُردوئے معلّٰی سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔

اس کربل کتھا کی تصنیف کے بعد اُردو نثر کی طرف بھی توجہ ہوئی مگر کم کم۔ اس لیئے کہ اس وقت تک ہماری زبان صرف نظم کے چٹخارے کی عادی تھی۔ اسے چھوڑ کر وہ کسی سادی بلکہ ابالی چیز کی طرف کیا بڑھتی اور کیونکر اُسے چکھتی چکھاتی ؟!

ہاں اس کے تھوڑے دنوں بعد، مرزا رفیع (سودا) نے اپنی طبّاعی دکھائی اور اپنے دیوان کے دیباچہ میں ورق دو ورق کی اُردو نثر بھی سنائی۔ پھر مرزا نے میر (میر تقی میر) کی مثنوی شعلۂ عشق کو بھی نثر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ خیر۔ جس طرح ہو یہ شوق دبا نہیں، اور آخر وہ کربل کتھا کی تصنیف سے بہتّر برس بعد باغ و بہار کی صورت میں جلوہ گر ہو کر ہمارے دماغوں کو باغ باغ کر گیا۔

میر امن نے چہار درویش کا یہ قصّہ ۱۲۱۷ھ میں تصنیف کیا۔ فرماتے ہیں۔ کہ "مرتّب ہوا جب باغ و بہار۔ تھے سن بارہ سو سترہ در شمار" ان کے بزرگ ہمایوں (بادشاہ) کے زمانہ میں ولایت سے ہندوستان آئے

اور اُس وقت سے شاہ عالم کے وقت تک دربار سے وابستہ رہے۔ انھوں نے قلعہ میں زبان سیکھی۔ یہ پشتینی زبان داں اور پوتڑوں کے اُردو داں ہیں اس لیئے ان کی اس چہار درویش (باغ و بہار) میں وہ زبان نظر آتی ہے جسے اردوئے معلّیٰ کہتے ہیں اور جو ان کے ہمعصروں کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔

حق یہ ہے کہ ہماری اُردو اُس وقت اور اُس کے بہت بعد تک ہمارے اُمرا اور اُن کے خاص متوسلین کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ عام لوگ ان سے سیکھتے، اسے پھیلاتے اور آگے بڑھاتے تھے۔ نواب فضلی بھی خاندانی امیر اور اس لیئے اُردو کے بادشاہ ہیں۔ ان کی اس کربل کتھا کا بہ اعتبار زبان نہ اُس وقت جواب ممکن تھا اور نہ اُس کے سو برس بعد تک ممکن ہو سکا۔

احمد شاہ اور اردوئے معلّیٰ

نادریوں کے عذاب سے ابھی ابھی یہ ملک چھوٹا تھا کہ دُرّانیوں کا حملہ شروع ہو گیا۔ اور یہاں پھر ایک تہلکہ مچ گیا۔ نادر (ہند سے جاکر) ابھی سفر میں تھا کہ اپنے ایک غلام کے ہاتھ سے مارا گیا۔ احمد، اُس کے

ایک فوجی افسر نے اُس کی جگہ لی اور وہ احمد شاہ ابدالی بن کر نادر شاہی کرنے لگا۔

اس ملک کا خون اس ابدالی کے منھ میں لگ چکا تھا، وہ پہلے اِدھر جھپٹا۔ پنجاب پر چڑھ دوڑا، اور لاہور و ملتان کو دبوچ ہی لیا۔ محمد شاہ ایکے غافل نہ تھا، اپنے ولیعہد احمد شاہ کو مقابلہ کے لیئے بھیجا۔ اس نے سرہند میں ابدالیوں کو (۱۷۴۸ء) مار بھگایا۔ ولیعہد سلطنت خوش خوش دلی لوٹا۔ فتح کی خبر سن کر بادشاہ شادی مرگ ہو گیا۔ اس کے ایک ہی مہینہ بعد اُس نے قضا کی اور احمد شاہ نے آبائی سلطنت پائی۔

احمد شاہ ایک ہوشیار اور کردہ کار جوان تھا۔ مگر جو تخت اُس سے نصیب ہوا اُس کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ وزیروں اور امیروں کی رقابتیں اور اُن کی سازشیں۔ ہاتھ پیر ہی شل ہوں تو کام چلے کیونکر اور جس گھر میں یہ خانہ جنگیاں ہوں وہ گھر تھمے کیونکر؟ دارالسلطنت میں اب نہ آصف جاہ ہی ہیں اور نہ برہان الملک۔ سلطنت کی باگ شہاب الدین خاں کے ہاتھوں میں اور اُن کی باگ چند نااہلوں کے قبضہ میں۔ ایک طرف روہیلے اُٹھتے ہیں تو دوسری طرف مرہٹے۔

بادشاہ کی جان عذاب میں اور سلطنت کی جان بے دردوں کی مٹھی میں۔ اس وقت کے آگے نادر گردی بھی گرد اور ایسے زمانہ میں مرہٹہ گردی بھی سرد ہے! یہاں جانوں کے لالے پڑے ہیں۔ زبان وادب اور شاعری تو دلجمعی اور سکون کی نشانیاں ہیں اور وہ خواب میں بھی نایاب۔ مگر بلے ریختہ (اردو) تیری ہڈی۔ نہ معلوم کس نیک گھڑی تیری نیو پڑی کہ ایسے بھونچال میں بھی نہ ہلی! کہتے ہیں کہ اس جان کنی میں بھی ہمارے ادیب بولتے رہے اور اُنھوں نے اُس وقت کا مرثیہ نظم کر ہی ڈالا۔ ان میں میر ضاحک کا شہر آشوب دیدنی تھا احمد شاہ کا زمانہ واقعی عجیب پرآشوب زمانہ تھا۔ مگر اس بادشاہ کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اردو کو اس کے نام سے بھی واسطہ رہا۔ اور ایک میر ضاحک ہی نہیں بلکہ دہلی کے ممتاز امیروں کی زبان سے بھی اس کا دَور یادگار رہ گیا۔

نواب محمد اکرام اللہ خانِ دردؔ، احمد شاہی اُمرا میں سے اور نواب عمدۃ الملک انجام (شہید) کے بھانجے ہیں۔ اُن کی زبان و شاعری کے بھی اُس وقت بڑے چرچے تھے۔ اور کیوں نہ ہو آخر کس ماموں کے بھانجے اور اردو کے کس گھر میں پلے تھے۔ ان کے یہ دو شعر سن لو اور داد دو۔ کہتے ہیں ؎

مرے سینہ میں ہر اک سانس ہو کر پھانس کسکے ہے ٭ خلش دل کی نکل جائے تو کیا آرام ہو جائے

دیکھو کیسی مشکل زمین میں کیسا شعر نکلا ہے۔ سنو۔

سامنے ہوتے ہی پھر لاش نہ پائی دِل کی ❖ رہ گیا نوک سناں پر صفِ مژگاں کے بیچ

اپنے ان امیر کی اصل زبان سننا اور ان کا مذاق دیکھنا چاہو تو اس غزل کو پڑھو

تحمل[1] آتشِ غم میں دلِ بیتاب کیا جانے ❖ ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے

دِوانہ، بیہودہ، رسوائے عالم ہم کو کہتے ہیں ❖ ہمارے عشق کی انشا کا تو القاب کیا جانے

کنارے سے کنارا کب ملے ہے بحر کا یارو ❖ پلک لگنے کی لذت دیدۂ پرآب کیا جانے

سمندر کو نہ دے نسبت مری آنکھوں سے تو ہرگز ❖ اوبلنے کی طرح چشموں سے یہ تالاب کیا جانے

تڑپتا دیکھ بسمل کو کہا یوں دردِ دل سے

ادب کے حق ادا کرنے کے یہ آداب کیا جانے

یہ ہے آج سے دو سو برس کی نظم۔ مگر یہ عمدۃ الملکی مدرسہ اُردو کا فیض تھا ورنہ اُس وقت کے اور اُن ادیبوں کو بھی دیکھ لو جنھیں نہ ہمارے امیروں سے رابطہ تھا اور نہ اس مدرسہ سے واسطہ۔ اس لیئے ان کی زبان کوری اور ان کی نظم ادھوری ہے۔ ہمارے یہ اُمرا اور امیر زادے اُس وقت صرف غزل ہی نہیں کہا کرتے تھے بلکہ وہ سلطنت کے رکن اور اس کے کاموں پر بھی

---

[1] تذکرۂ حکیم قدرت اللہ قاسم۔

مامور تھے۔ یہ نواب (اکرام اللہ خاں) بھی ہمیشہ برسرِ کار رہے اور مرہٹوں کی لڑائی میں اپنے بادشاہ (احمد شاہ) کا ساتھ دیکر حق نمک ادا کر گئے!

اسی احمد شاہی دور کے وہ مشہور فدوی بھی ہیں جو پنجابی و لاہوری کہلائے مگر عمر دلّی میں گذار دی۔ یہ جب ہندو تھے تو مکند رام بنے رہے اور مسلمان ہونے پر محمد حسن ہو گئے۔ بادشاہ (احمد شاہ) کی تعریف میں انھوں نے ایک قصیدہ عرض کر کے گذارا۔ اس کی بڑی قدر ہوئی حضور نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی۔ سودا سے اور اِن سے بڑے معرکے رہے ہیں۔ ایک نے دوسرے کی ہجویں کہیں اور وہ طشت از بام ہوئیں۔ فدوی پایہ کے شاعر ہیں۔ نگاہ یار لے ڈوبلی، سری یکبا لے ڈوبلی کے قافیہ و ردیف میں اِن کا یہ شعر سنو۔

مطلع۔ نہ پوچھو رنگ مہندی کا کفِ قاتل پہ اے یارو۔
کسی کے خون میں اس کے ہاتھ کو تلوار لے ڈوبلی

ایک غزل کے دو شعر اور بھی۔

مطلع۔ آنسو نہیں ہیں دیدہ تر میں بھرے ہوئے۔ موتی ہیں آبدار صدف میں بھرے ہوئے

لہ تذکرہ گلزار ابراہیمی۔

مقطع ۵ فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے + اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے

خاندان تیموریہ میں شہزادوں، شہزادیوں کے لیئے انّائیں چن کر رکھی جاتی تھیں۔ اُن کا عالی خاندان ہونا لازمی تھا کہ اُن کے اچھے دودھ سے سلطنت کے ان گوہروں کی پرورش ہو سکے۔ اکبر کی انّا ماہم انکہ اور بادشاہ پر ان کا اثر ہر تاریخ داں جانتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑے گھرانے کی بی بی اور ایک مشہور ترکی قبیلہ سے تعلق رکھتی اور اس پایہ کی تھیں کہ اکبر اُن کا صرف پاس و لحاظ ہی نہیں کرتا بلکہ ملکی امور میں بھی اُن سے مشورہ لیتا تھا۔

ان انّاؤں کی اولاد کا بھی خاص خیال کیا جاتا، وہ بھائیوں کی طرح سمجھے جاتے اور شاہوں کی بغل میں جگہ پاتے۔ یہ دودھ بھائی، "کوکا" (ترکی لفظ) کہلاتے اور کوکلتاش، مرزا کوکلتاش اور مرزا کوکلتاش خاں کے (علیٰ قدر مراتب) لقبوں سے یاد کیئے جاتے تھے۔ ایک اکبر ہی نہیں، اس کے بعد بھی اس خاندان میں یہ طریقہ جاری اور انّاؤں اور اُن کی اولاد کے ساتھ یہ برتاؤ قائم رہا۔

احمد شاہ بادشاہ کی انّا بھی ایک بڑے درجہ کی عورت تھیں اور اُن کے فرزند اشرف علی خاں اس پایہ کے تھے کہ تخت کے پاس

جگہ پاتے اور شہزادوں کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ اِن کی بڑی عزت کرتا اور نواب اشرف علی خانِ کوکا کہہ کر پکارتا اور انھیں اپنا بھائی سمجھتا یہ قلعہ میں پلے اور اردوئے معلّیٰ کی آغوش میں بڑھے ان کے ادب و شاعری اور ان کی زبان کے اُس وقت ڈنکے بجتے تھے۔ شاعری کا شوق ہوا تو فغاں بن کر اپنے جذبات (اردو میں) ادا کرنے لگے۔ احمد شاہ کی یہ بھی خوش بختی ہے کہ ایسے پر شور زمانہ میں فغاں کا سا صاحب زبان پیدا ہوا جس نے اپنے زور زبان سے اس بادشاہ کے نام کو بلند کر کے اُس کا ڈنکا بجا دیا۔

نواب فغاں صاحب دیوان تھے مگر ان کا کلّیات اب نایاب ہے تذکروں میں ان کی غزلیں ملتی اور ہمارے امرا کی زبان کو یاد دلاتی ہیں نواب کی یہ غزل خاص طور پر مشہور اور اس پایہ کی ہے کہ اِس وقت کے زبان دان بھی اسے اپنے سر آنکھوں پر جگہ دیں۔ اس غزل کے ایک شعر کی سودا نے بہ فخر تضمین کر کے لیئے ان امیر کی خدمت ادا کی ہے۔ اس کے چند شعر سنو اور اپنے امرا کی اُردو اور اُن کے لب و لہجہ پر نظر کرو۔ غزل:۔

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گذر گئی ؛ اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو بہر حال شکر ہے ؛ یوں بھی گذر گئی مری دوں بھی گذر گئی! واہ رے زبان

وہ شعر، مرزا رفیع (سودا) نے جس کی تضمین کی ہے۔

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی؟ ! سبحان اللہ۔

قطعہ

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں ؛ انصاف کو نہ چھوڑ مروّت اگر گئی
آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا ؛ وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی؟ واہ

نواب اشرف، مرہٹہ گردی اور شہاب الدین خاں وزیر کی بے دردی سے تنگ آکر آخر دلی سے نکلے۔ اپنے بھائی محمد ایرج خاں[1] پاس مرشد آباد چلے گئے۔ پھر عظیم آباد (پٹنہ) آئے۔ وہاں بڑے کروفر سے رہے اور وہیں دنیا سے گذر گئے۔[2]

صاحب آبحیات نے نواب کے پٹنہ جانے اور مہاراجہ شتاب رائے دیوان سے ان کے ربط وضبط اور پھر وہاں کی ایک صحبت کا حال یوں تحریر کیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے لطائف بڑھتے بڑھتے ان سے اور راجہ سے

---

[1] یہ ایرج خاں، فغاں کے چچا نہیں رشتہ کے بھائی تھے (تذکرۂ شعرائے اردو از کریم الدین)
[2] فغاں نے ۱۱۸۶ھ میں نہیں، ۱۱۹۶ھ میں قضا کی (تاسی)

"صاحب سے بھی شکر رنجی ہوگئی۔ اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ درّانی"
"نے جو سلطنت پر حملے کیئے، ایک دن اُس کی دست درازی اور"
"بے اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ خدا جانے طنز سے یا سادہ مزاجی سے"
"راجہ صاحب نے کہا کہ "نواب صاحب، ملکۂ زمانی کو احمد شاہ درانی"
"کیونکر لے گیا؟" انھیں یہ بات ناگوار ہوئی۔ افسردہ ہو کر بولے کہ"
"مہاراج جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا!" اس دن سے"
"دربار میں جانا چھوڑ دیا"

نہ معلوم آزاد مرحوم نے یہ حکایت کس سے سُنی اور اُسے جانچے بغیر اپنے تذکرہ میں نقل کر گئے! بہار اور ارد و کے ذکر میں میں نے فغاں اور شتاب رائے کا مفصل حال درج کر دیا ہے۔ یہاں مختصر کہوں گا۔ یہ ملکۂ زمانی کون ہیں؟ یہ نہیں کھلتا۔ اگر اس سے مراد احمد شاہ بادشاہ کی وہ حرم ہے جس کا نام بھی ملکۂ زمانی تھا تو اس کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ ابدالی اُسے اڑا لے گیا!

نادر کے بعد (جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا) اُس کے جنرل اور جانشین احمد شاہ ابدالی نے ہند پر ۱۷۴۸ء میں حملہ کیا۔ یہ محمد شاہ بادشاہ کا وقت ہے۔ ولیعہد سلطنت یعنی احمد شاہ (بادشاہ) اُس کے مقابلہ کے لیئے بھیجا جاتا ہے۔

سرہند میں لڑائی ہوتی ہے اور ابدالی (احمد شاہ) شکست کھا کر بھاگتا ہے۔ اس جنگ میں یا اس کے بعد، ابدالی کو ایسی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ مالِ غنیمت کے طور پر شاہی اموال پر دست درازی کر سکے، چہ جائیکہ احمد شاہ (بادشاہ) کی کسی حرم کو لے جا سکے۔ اگر وہ اس وقت ایسا کرتا تو شاہی لشکر اس کا پیچھا نہ چھوڑتا!

احمد شاہ اسی ۱۷۴۸ء میں بادشاہ ہوتے اور ۱۷۵۴ء تک شاہی کرتے ہیں۔ غازی الدین وزیر، ان کا دشمن ہو جاتا اور آخر انھیں اندھا کر کے تخت سے اُتارتا اور عالمگیر ثانی کو بادشاہ بناتا ہے۔ اس عالمگیر کے زمانہ یعنی ۱۷۵۶ء میں ابدالی پھر ہند پر حملہ کرتا اور دہلی کا محاصرہ کر لیتا ہے۔ اس جنگ میں چونکہ احمد شاہ (بادشاہ) کسی عنوان سے طرفِ مقابل نہیں اس لیئے اس کی کسی چیز پر تاخت ایک بے معنی سی بات ہے۔ اور اس لیئے احمد شاہ کی کسی حرم (وہ ملکہ زمانی ہوں یا کوئی اور) پر دست تصرف ایک لغو سی حکایت ہے!

اب رہا یہ کہ شاہی خاندان میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی جسے طنز کے طور پر مہاراجہ شتاب رائے نے نواب فغاں سے دریافت کیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ، مہاراجہ، سلطنت دہلی کے پروردہ اور حکومت

کی طرف سے اُس وقت عظیم آباد (پٹنہ) کے دیوان ہونے کے علاوہ ایک نہایت سنجیدہ بزرگوار تھے۔ وہ تخلیہ میں بھی ایسی چھچھوری اور تہذیب سے گری ہوئی بات، نواب فغاں کے سے باوقار امیر اور احمد شاہ (بادشاہ) کے ایک بھائی کے آگے پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور وہ اگر بھولے سے بھی ایسا کرتے تو اُسی وقت اس کا مزا چکھ لیتے۔ نواب فغاں اُن کا کام تمام کیئے بغیر اس صحبت سے نہ اٹھتے اور اپنے ان دیوان کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیتے! دوسری طرف خود فغاں ہیں۔ اُن کی تربیت و متانت کیونکر گوارا کر سکتی تھی کہ وہ اپنے دیوان (شتاب رائے) کے جواب میں ایک مذہبی قصہ چھیڑ بیٹھتے۔ سیتا جی، دیبی ہیں، اِن کی عزت ہر ملت کا آدمی کرتا ہے۔ فغاں اتنے بے تمیز نہ تھے کہ راون کی حکایت دہرا کر وہ اُس وقت یوں بدلہ لیتے!

آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی دُھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے قلم کو آزاد کر دیتے ہیں۔ اس داستان اردو میں اکثر جگہ مجھے مجبوراً اُن کی بھول کو دکھانا اور اسے ٹھیک کرنا پڑا ہے۔

نواب فغاں کے متعلق اتنا اور سُن لینا چاہیئے کہ وہ عظیم آباد (پٹنہ) آکر بڑے دبدبہ اور امیرانہ ٹھاٹھ سے رہے۔ اپنی املاک کے علاوہ سرکار کمپنی (ایسٹ انڈیا) سے بھی انھیں بیش قرار نذرانہ ملتا رہا۔ اس وجہ سے وہ بے نیاز و آزاد تھے۔ یہ باتیں ہمارے گھر کی یا ہمارے گھر کے تعلقات کی ہیں۔ پروفیسر آزاد ہمارے امیرانہ و رئیسانہ اندازوں اور نزاکتوں کو کیا سمجھیں۔ اب اس ذکر فغاں کو اُن کے چند مزید اشعر سنا کر ختم کرتا ہوں! سنیئے ؎

مطلع ؎ عشاق تیرے گرمی بازار کر گئے ✢ اس جنس کو گراں یہ خریدار کر گئے!

مطلع ؎ نہ کھولیئے ترے بندِ قبا تو کیا کیجئے ✢ دلِ گرفتہ کو ظالم کبھی تو وا کیجئے

مطلع ؎ بے فائدہ ہے آرزوئے سیم و زر فغاں

کس زندگی کے واسطے یہ دردِ سر فغاں

شعر ؎ بوئے کباب سوختہ آتی ہے خاک سے ✢ دامن سے کیا گرا کوئی لختِ جگر فغاں

مطلع ؎ مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے

آ مرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے

شعر ؎ کج کلہ تیغ بکف چین بر ابرو بے باک ✢ یا الٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے

مقطع ؎ لیئے جاتی ہے اجل، جانِ فغاں کو لے یار

لیجیو! تیر گرفتار کہاں جاتا ہے!

اس لیجیو میں ذرا زبان کے لطف و انداز کو دیکھنا۔ احمد شاہ! آپ کو اپنے ان دودھ بھائی (کوکہ) پر بیجا ناز تھا۔ یہ آپ کے دربار کے ان امیروں میں سے ہیں جن کی زبان ٹکسالی ہے۔ اور اُس وقت کے شعرا جن کے خوانِ نعمت کے نمک چش رہے اور پھر رتبۂ عالی تک پہنچے ہیں!!

عالمگیر ثانی اور اُردوئے معلّٰی

محمد شاہ کے بعد ہی سلطنت کے حصّے بخرے ہو گئے۔ احمد شاہ نے اپنی مختصر حکومت (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) میں اپنے گھر کی گرجی ہوئی[۱] دیوار کو سنبھالنا چاہا مگر وہ تڑخ چکی تھی کیا ٹھہرتی پھر شہاب الدین خاں

[۱] گرجنا بمعنی تڑخنا۔ یہ محاورہ اور جوہریوں کی اصطلاح بھی ہے جیسے "یہ زمرد تھا تو اچھا مگر ذرا گرج گیا" یعنی اس میں بال پڑ گیا۔ میر انیس نے کیا خوب کہا ہے ؎

عالمِ پیری میں آئے کون پاس ہلے عصا گرجی ہوئی دیوار ہوں

اصطلاح اور محاورہ نہ جاننے والوں نے اس گرجی ہوئی کو گرتی ہوئی بنایا ہے۔ مگر یہ وہی ہیں جو انیس کی زبان نہیں سمجھتے۔ "گرتی ہوئی دیوار" اول تو بے معنی سی بات ہے۔ دوسرے اس میں لطف کلام ہی کیا ہے؟ یہاں انیس نے خود کو جواہر سے تعبیر کر کے اس کی ایک لطیف اصطلاح صرف کی۔ نری دیوار کی تشبیہ مذاق سے گری ہوئی تھی۔ اسے اس گرجی ہوئی نے سنبھال لیا۔

وزیر کی شاہی لے شاہجہاں آباد کی مضبوط شہر پناہ میں کچھ نئے سوراخ ڈال دیے۔ احمد شاہ کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی اور اس کی جگہ عالمگیر (ثانی) کو دی گئی۔ یہ بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ ابدالی (احمد شاہ) نے پھر سر اٹھایا اور وہ دریا کی طرح موجیں مارتا پنجاب تک بڑھا چلا آیا۔ دلّی پھر لٹی اور ایکبار (۱۷۵۶ء) یوں اجڑی کہ پھر نہ سنوری! مرہٹوں نے الگ زور کیا۔ شاہ ہند بننے کی ہوس میں دکھن کے پیشواؤں[۱] نے اُتّر کی طرف پیش قدمی کی اور آخر شاہجہاں آباد میں گھس کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی!

ان مرہٹوں کا زور اس وقت معمولی نہ تھا۔ سلطنت کے ہوا خواہوں نے خود میں بوتا نہ دیکھ کر ابدالی کو بلایا کہ اُن کا سر نیچا کرے۔ احمد شاہ دوڑا۔ اور پانی پت کے تاریخی میدان میں ابدالیوں اور مرہٹوں میں ٹھن گئی۔ یہ لڑائی (۱۷۶۱ء) پانی پت کی تیسری لڑائی مشہور ہے جس نے تیسری دفعہ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کیا۔ مرہٹے، مارے، ہٹے بھاگے۔ ابدالی اپنی فتح کا نشان اڑاتے واپس گئے لیکن اب کے ملک

---

[۱] مرہٹوں کے سرداروں کا لقب پیشوا تھا

بے میر کا ہو کر اور ابتر ہو گیا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) اس وقت پلاسی کا میدان (۱۷۵۷ء) لیکر بڑھ چلے تھے پورب سے پچھم تک انھیں کھلا رستہ ملا۔ چاٹ میں بڑھے اور بکسر پر ہاتھ مار کر اور شیر ہو گئے۔ اس کا قصّہ آگے آتا ہے۔

ایسی ہلچل کسی اور ملک میں ہوتی اور انقلابوں کی ایسی اُپی تلوار کسی اور قوم کے سر پر یوں چمکتی تو دل بجھ جاتے۔ مگر یہاں اب تک وہ گرمائے ہوئے اپنے بخارات نکال رہے تھے! کہتے ہیں کہ۔ ادب کا چسکا وہ بد بلا ہے کہ تلوار کی جھنکار میں بھی اسی کی خوش آیند آواز کانوں میں آیا کرتی ہے! ہم نے اس چبھتے ہوئے فقرہ کو سچ کر دکھایا۔ ہماری رگ رگ میں ادب پیوست اور خون کی طرح دوڑ رہا اور اس وقت ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ منھ سے نکل رہا تھا۔

اس عالمگیر (ثانی) نے بھی اپنی سرد آہیں ادب ہی کے منھ سے نکالی ہیں شہزادگی کے زمانہ میں اسے تخت کی بڑی آرزو تھی سلطان جی (نظام الدین اولیا) کے مزار پر حاضر ہوتا اور وہاں اپنی شاہی کی دعائیں

---

۱ اس وقت عرصہ تک دلّی بادشاہ سے خالی رہی۔ عالی گوہر (بعد کو شاہ عالم) بھی بنگالہ چلا گیا تھا۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ بے میر گنجفہ کا ایک پتہ) بازی ابتر۔

مانگتا۔ جب بخت سے اسے تخت نصیب ہوا تو اپنے مرشد کی شان میں اس نے چند شعر نظم کیئے اور بہ طور نذر اُن کے مزار پر چڑھا دیے جو وہاں کندہ ہیں۔ بادشاہ عرض کرتا ہے ؎

جو ہووے خادِم نظام الدین کا دِل سیں لے غریب
اُس کے تئیں ہوتا ہے تاج خسروی جگ میں نصیب
خادمی کی تھی عزیز الدین نے باصِدق و یقیں
تاج شاہی ہند کا مجھ کو دیا ہے عنقریب
مرض دل افگار کا میرے وہ صحت بخش ہے
بے غذا و بے دعا و بے دوا و بے طبیب
بس پریشاں حال ہے اب خلق میں محبوب حق
فضل کر تقصیر واروں پر تم ہو حق کے حبیب

دیکھو۔ عزیز الدین عالمگیر، تخت پر بیٹھ کر اپنے بخت کو روتا اور اب بھی پریشان حال ہے اور اپنا دکھ درد نظم کی زبان سے دہراتا اور محبوب الٰہی سے مدد مانگتا ہے!

یہ اُسی شاہی مذاق کا اثر تھا کہ ایسے کڑے وقت میں بھی شاہ

مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، سراج الدّین علی خانِ آرزو، مرزا مظہر جانِ جاں[1] اور شاہ حاتم کے سے زبان پرست بزرگوار اسی اجڑے دیار (دلّی) سے اٹھے اور وہیں ڈھیر ہوگئے! یہ وہ صاحب زبان ہیں جو اپنے امیرِ کے مٹنے پر بھی اُردوئے معلّٰی کو سینہ سے لگائے، بہلتے اور اُسے بہلاتے رہے!

میر ضاحک بھی اسی خزاں دیدہ باغ (دلّی) کے وہ گل اور میر حسن بھی اسی اُجاڑ چمن کے وہ پھول ہیں جو حضرت دہلی[2] کو بھرے دِل سے رخصت کرتے اور فیض آباد کے سے گلزار میں قدم رکھ کر اُردو کے پودے کو سینچتے ہیں مرزا رفیع (سودا) بھی اُسی تلاطم میں گھر سے نکلے اور لکھنؤ جاکر آسودہ ہوئے میر تقی میر نے ذرا اپنی سیادت دکھائی۔ کچھ دن صبر سے گذارے۔ مگر کب تک؟ آخر گھر قفس بنا۔ اور سے کون رو رو کے زندگی کاٹے۔ میر دلی میں جی نہیں لگتا۔ فرما کر یہ بھی لکھنؤ چلے جاتے اور وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ اتنے بڑے شہر

---

[1] ان کا نام مرزا مظہر جانِ جاں ہی ہے نہ کہ مظہر جانِ جاناں۔ شاہانِ تیموریہ اپنے خانہ زادوں کے بچوں کا نام خود رکھتے تھے۔ مرزا، عہدِ عالمگیر میں پیدا ہوئے۔ اس کی خبر بادشاہ کے گوش گذار کر کے مولود کا نام رکھنے کی گذارش کی گئی۔ عالمگیر نے مرزا کے والد کا نام دریافت کیا۔ عرض ہوئی کہ مرزا جان۔ بادشاہ نے مسکرا کر فرمایا کہ "بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے، اسے جانِ جاں کہو۔" اس دن سے ان کا یہی نام پڑ گیا۔ تاریخ سیر سے نابلد اتنے بڑے شخص کے اصل نام سے بھی بے خبر ہیں۔ جو دل میں آتا لکھ دیتے اور اسے ٹھیک سمجھتے ہیں (مآثر الامرا)

[2] پرانے لوگ دلّی کو تعظیماً حضرت دہلی کہا کرتے تھے۔ غدر کے بعد اس کا اتنا ادب بھی جاتا رہا۔

(دلّی) میں اب ایک خواجہ میر (درد)[1] کا دم ہے ۔ باقی برکت! واقعات و واردات نے دلوں کو ہلا دیا اور موت کو سامنے کھڑا کر دیا ہے ۔ درد اپنا دکھ درد بھلاتے اور ؎

ساقیا، یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

فرما کر گھر بیٹھے دنیا کا تماشا دیکھتے اور دکھاتے رہتے ہیں بلا!

شاہ عالم اور اُردوے معلّیٰ

اورنگ زیب کے بعد اس ملک کا نقشہ اس داستان کے پچھلے ورقوں میں ذرا نظر آگیا ہوگا۔ محمد شاہ کے مرنے پر جس طرح پنجاب، اودھ اور دکھن دارالسلطنت سے الگ ہوئے، اُسی طرح بہار و بنگال بھی دلّی سے دور ہو گیا۔

علی وردی خانِ مہابت جنگ اب اس خطہ (بہار و بنگال) کے صوبہ ہیں اور نیم مختار۔ بہار کے پٹھان سر اٹھاتے اور اڑیسہ کی طرف سے مرہٹے سر نکالتے ہیں ۔ مگر یہ جہاندیدہ تُرک[2] ایک سا تھ

[1] ہماری زبان پر خواجہ میری، بزرگوں سے میں نے یوں ہی سنا ہے [2] نواب مہابت جنگ ترک تھے نہ کہ افغان ۔ انگریزی تاریخیں ہماری باتیں اکثر غلط کہتی ہیں نواب کے حالات بہار و اڑیسہ کے باب میں تفصیل سے ملیں گے ۔ انھوں نے سنہ ۱۷۴۰ء سے سنہ ۱۷۵۶ء تک سولہ برس بنگالہ میں حکومت کی

دونوں کا مقابلہ کر کے اُن کے مُنھ پھیر دیتا ہے۔ فتح و صلح کے بعد ابھی یہ سید ھا کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ موت نے بٹھا دیا۔ اس بوڑھے نواب کے نوجوان نواسے[۱] سراج الدولہ نے گدّی پائی اور مسندِ بنگالہ پر ایک آفت آئی۔

انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) اُس وقت اپنی سیاسی چال (ڈپلومیسی) سے دلندیزیوں (ڈچوں) اور فرانسیسیوں کو نیچا دکھا کر خود کو اونچا کر رہے تھے۔ نئے نواب کو یہ چالیں نہ بھائیں کلکتہ کا محاصرا اور فورٹ ولیم پر حملہ ہوا۔ انگریز، قلعہ کے آبی دروازے (واٹر گیٹ) سے بھاگ کر جہازوں میں جا بیٹھے۔ سراج الدّولہ نے اِدھر فرانسیسیوں کو اپنا کرنا چاہا اور اُدھر کلائیو نے جو اُس وقت مدراس میں تھا، نواب سے بدلا لینا چاہا۔ واٹسن (امیر البحر) کی مدد سے کلکتہ پھر ہاتھ آگیا۔

کلائیو نے اب فرانس ڈانگہ[۲] (چندر نگر) پر ہاتھ مار کر مرشد آباد کی

---

۱ سراج الدّولہ، مہابت جنگ کا لے پالک نہیں نواسہ تھا یہ نواب کی صاحبزادی آمنہ بیگم کے بطن سے پیدا ہوا، اور نواب ہیبت جنگ (نواب شہید) کا لڑکا تھا۔ مہابت جنگ کے اولاد نرینہ نہ تھی اسلیئے مسند بنگالہ کا وارث یہی تھا۔ ۲ چندر نگر (جہاں فرانسیسی آبادی تھی) کا پرانا نام فرانس ڈانگہ ہے۔ یہ جگہ کلکتہ سے ۳۰، ۴۰ میل پچھم اب بھی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں ہے۔

طرف پیر بڑھایا۔ سراج الدولہ بھی نکلا اور پلاسی کے میدان میں دونوں طرف کے جوان کھڑے ہو گئے۔ میر جعفر اس وقت ہماری فوج کا سالار تھا۔ ہندی سپاہیوں کو دیکھ کر انگریز گم ہوئے۔ وہ ہٹنے پر تیار تھے کہ کلائو پھر ایک سیاسی چال چلا۔ میر جعفر کو مسندِ بنگالہ کا لالچ[۱] دے کر سراج الدولہ کی طرف سے اُسے توڑ لیا۔

دوسرے دِن لڑائی چھڑی۔ فوجیں بڑھیں۔ مگر میر جعفر کے چندہ زیر کمان جوان، جو انگریزوں کے مقابلہ میں تھے، اڑے رہے۔ سراج الدولہ یہ دیکھ کر گھبرایا۔ میر جعفر پاس جا کر منتیں کیں، خوشامدیں کیں، پگڑی تک اُس کے پیروں پر رکھی۔ مگر طمع[۲] اُسے سننے نہیں دیتی کوئی پند!

[۱] اس لالچ کا قصہ بنگالہ اور اردو کے باب میں پڑھنا۔ امین چند (اُمے چند) کا احوال، کلائو کے تین لاکھ رشوت دینے کا وعدہ اور مشہور سرخ و سفید کاغذوں کے جعل کا حال کھل جائے گا۔

[۲] میر جعفر، حاجی مرزا احمد (نواب مہابت جنگ کے سوتیلے بھائی) کی ماں کا رشتہ دار تھا صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے۔ کہ مہابت جنگ کی ایک سوتیلی بہن، شاہ خانم نام (جو کسی حرم سے تھی) میر جعفر سے منسوب ہوئی۔ میرن، اُسی خانم کا لڑکا تھا۔ (سیر المتاخرین انگریزی جلد دو صفحہ ۲۴۱)

میر جعفر، نواب (مہابت جنگ) کے یہاں پہلے بکاول (داروغہ باورچی خانہ) تھا رفتہ رفتہ ترقی کی۔ پھر فوج میں بھرتی ہوا۔ بعد کو سراج الدولہ نے اسے اپنا میر لشکر بنایا۔ اسے آخر، پلاسی میں فوج کی کمان دی گئی۔ اور پھر جو اُس نے کیا، ظاہر ہے!

وہ نہ ہلا۔ نواب خود کو خطرے میں دیکھ کر میدان چھوڑ جنگل کی طرف نکل گیا۔ معمولی لڑائی کے بعد جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) یوں سر ہوئی! کلائیو نے فتح اور میر جعفر نے اس طرح مسند پائی اور مغلوں کے اقبال کی بہار، تین سو برس بعد، اُسی میدان میں آخر خزاں ہو گئی!

اب میر جعفر، نواب ہیں اور کلائیو، نواب گر! مگر ان بن بنی نہیں۔ بڈھا (میر جعفر) گدّی سے جلد اُتار اگیا۔ اور میر قاسم اُس کا جوان داماد، نواب بنایا گیا۔ اودھر شہزادۂ عالی گوہر (بعد کو شاہ عالم) نے بنگالہ کی روداد سُن کر پچھم سے پورب کا رخ کیا اور وہ بہار پہونچ گیا۔ اِدھر میر قاسم (جو اَب مرشد آباد کے عوض مونگیر میں بیٹھا اپنی طاقت بڑھا رہا تھا) بھی چُپ نہ رہا۔ انگریزوں سے لڑ کر اُس نے عظیم آباد (پٹنہ) کا محاصرہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰۔ عمر سعد نے بھی جنگ کربلا میں یہی کیا تھا۔ ولایتِ رے (موجودہ تہران) کے دینے کا اس سے وعدہ کیا گیا۔ اور اس لالچ میں وہ امام حسینؑ کا دشمن ہو گیا۔ عمر سعد و میر جعفر کا ایک سا فسانہ ہے۔ بنگال و دکھن کے ان قصوں کو یاد کر کے ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ہے۔ کہ ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکھن — ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن!

یہ صادق بھی کاذب اور میر جعفر کے دوسرے بھائی ہیں جنھوں نے دکھن میں ٹیپو (سلطان) سے غدّاری کی! سلہ سراج الدولہ کو میرن (پسر میر جعفر) نے دغا سے شہید کیا اس میرن پر آخر بجلی گری اور یوں وہ خاک سیاہ ہوا۔

(۱۷۶۳ء) کر لیا اور اس کے افسر فوج میجر سمرو[۵۱] نے شہر کو لے کر قتلِ عام شروع کر دیا۔

انگریزوں نے پھر اپنی کٹ پتلی[۵۲] میر جعفر کو (میر قاسم کی جگہ) مسندِ بنگالہ کا شیر قالین بنایا۔ اُدھر میر قاسم نے نواب شجاع الدولہ (اودھ) کی مدد سے بنگالہ و بہار پر قبضہ کرنا چاہا۔ بہار کے مغربی سرحد بکسر میں فوجیں جمع ہو گئیں۔ انگریزوں کی طرف سے میجر منرو دوڑا، اور فوراً بکسر پہونچ کر اس نے بڑھتے ہوئے لشکر کو روکا۔ کرم ناسا ندی کے پاس لڑائی ہوئی شجاع الدولہ کی کمزوری سے میر قاسم گویا اکیلا لڑا، اور پسپا ہو کر بھاگا۔ ۱۷۶۴ء میں یہ مشہور جنگ یوں ختم ہوئی اور کرم ناسا کے کنارے ہندیوں کا کرم ناس کر کے اس طرح اُن کی لٹیا ڈبوئی گئی!

عالی گوہر اپنے باپ عالمگیر ثانی کی شہادت (۱۷۵۹ء) کے بعد بادشاہ اور شاہ عالم بن چکے تھے۔ اس وقت وہ بکسر سے قریب اور اس جنگ میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر

---

[۵۱] میجر سمرو کے حالات بہار اور اردو کے باب میں پڑھنا۔ اور بیگم سمرو کا حال انگریز اور اردو کے ذکر میں دیکھنا۔ بیگم اردو کی شیدا اور شاعری کی بڑی دلدادہ تھی۔
[۵۲] اس انگریزی کھلونے کو ہمارے بنگالی بھائی کلائو کا گدھا بھی کہتے ہیں۔

انگریزوں کے خاص رجمنٹوں [۱] نے انھیں لڑائی میں شریک ہونے سے باز رکھا۔ اس کے صلہ میں کمپنی (ایسٹ انڈیا) نے بھی جو اب بنگال و بہار کی مالک ہو چکی تھی، شاہ عالم کو بادشاہ مان لیا۔ کلائو اس وقت ولائت میں تھا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۷۶۵ء میں وہ پھر یہاں بھیجا گیا اس سے اور نئے شاہ ہند سے نیا سمجھوتا [۲] ہوا۔ کلائو، نواب ثابت جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ پھر انھیں بنگالہ کی دیوانی (صوبہ داری) چھ کرور سالانہ کی تحصیل اور ڈھائی کرور کی آبادی عنایت ہوئی۔ اور ہملٹن صاحب کی چپہ بھر زمین بڑھ کر آخر لاکھوں گز کی ہو گئی!

شاہ عالم کا اصل جلوس الہ آباد میں ہوا تھا۔ مرہٹوں کی ترغیب سے وہ (۱۷۷۱ء) شاہجہاں آباد تشریف لے گئے تو بارگاہ سلطانی کی بساط الٹ چکی اور لال قلعہ میں خاک اڑ رہی تھی۔ اس وقت کو یاد کر کے ہمارے ایک مشہور اہل قلم نے حق کہا ہے۔ کہ "اس وقت دلی کا

---

[۱] انگریزوں کے ان خاص رجمنٹوں کا نام ونشان بہار اور اردو کے ذکر میں دیکھنا۔

[۲] بزرگوں سے سنا کہ اس نئے سمجھوتے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہاں کی ملکی زبان (ہندوستانی) کی حفاظت و نگہداشت بھی تھی۔ عہدنامہ میں بادشاہ کا ۲۶ لاکھ سالانہ نذرانہ مقرر ہوا جو کچھ دن انھیں ملتا رہا۔ مگر وارن ہیسٹنگز نے ایک بہانہ نکال کر۔ وہ شاہی حق بھی بند کر دیا۔ زبردست کا ٹھینگا بھاری!

دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ تھا اور اس کے سجّادہ نشین شاہ عالم تھے'! مگر شاباش شاہ عالم! کہ اس عالم میں بھی تو اپنے وظیفہ کو نہ بھولا. اور اپنے داداشاہجہاں کے سبق کو تازہ کرتا رہا۔ کیوں نہ ہو، آدب اِس گھر کا آئین اور زبانوں سے اُنس مغلوں کا دین رہا ہے۔ وہ کیونکر فراموش ہوتا؟!

شاہ عالم! آپ کے شاہانہ اخلاق اور آپ کی رعایا پیروری پر ہندوستان قربان! آپ نے صرف یہاں کی زبان ہی کو نہیں سرفراز بلکہ اپنی رعیت کو بھی ہمیشہ نوازا۔ ایک برہمنی آپ کی بہن اور شہزادیوں کی پھُپھی بنی۔ اس کے ہاتھ سے آپ نے راکھی بندھن بندھوایا اور ہندو مسلم رشتہ کو مضبوط کر دکھایا۔

عالمگیر ثانی جب دغا سے کوٹلہ (فیروز شاہ، دہلی) میں شہید کیئے گئے تو ان کی لاش جمنا میں ڈال دی گئی۔ بہتے بہتے وہ رات کو ایک کنارے جا لگی۔ اتفاقاً ادھر سے ایک عورت گذری۔ لاش دیکھ کر جھجکی۔ پھر پہچان کر اس کے پاس بیٹھ گئی کہ صبح ہو تو خبر کرے۔

یہاں قلعہ میں بادشاہ کی سواری کوٹلہ سے نہ لوٹی تو فکر بڑھی۔

تلاش ہوئی مگر پتہ نہ چلا۔ صبح کو حال کھلا۔ شاہی لاش اور وہ عورت قلعہ میں لائی گئی۔ شاہ عالم بادشاہ ہوئے۔ آپ نے اس عورت کو انعام اکرام دیا اور اُسے اپنی بہن بنایا! اس دن سے یہ بہن جن کا نام رام کُور تھا قلعہ میں اپنا حق جتا کر آتیں اور رہتیں۔ انھیں کی خاطر سے ہندوؤں کی ایک خاص رسم سلونو کی شاہی محل میں پہل ہوئی۔ یہ پرب سالانہ منایا جاتا اور اس میں کل ہندوانی ریت رسم[۱] برتا جاتا۔

برسات میں یہ تہوار ہوتا۔ جھولے پڑتے، پینگ بڑھتے، چولھے سلگتے، کڑھائیاں چڑھتیں اور عورتیں پکوان تلتیں۔ اتنے میں بہن جی آتیں اور سونے کی قُطّی میں کچھ ساتھ لاتیں۔ حضور (بادشاہ) تک پہونچتیں اور اپنی قُطّی سے سچے موتیوں کا سمرن نکالتیں۔ اس میں سونے کی گھنڈیاں ہوتیں۔ جھک کر ایک ادا کے ساتھ شاہ عالم کی کلائی میں اُسے باندھتیں بادشاہ مسکراتے اور بہن جی کی پیٹھ پر ہاتھ دھرتے اور اُن کی اور اُس راکھی بندن کی سلامتی کی دعا کرتے۔ پھر اُن کے ہاتھ میں خود بدولت زمرد کی چوڑیاں پہناتے اور بھائی ہونے کا حق ادا کرتے۔ پھر شال

---

[۱] رسم تذکیر بھی ہے۔ رسم ہے یہ نگوڑا مارا نیا، الٹا دینا پڑا ہے خون بہا (جان صاحب)

دوشالے بٹتے۔ برہمن بڑھ کر اسیس (دعا) دیتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کی دھوم مچتی، باجے بجتے، ناچ رنگ ہوتے، ساز چھڑتے اور گلے پڑتے محفل اٹھتی تو شاہ بھائی کے گھر سے رام کور بہن ایک شان سے رخصت ہوتیں شہزادیوں کے جھرمٹ میں درِ دولت تک آتیں اور پھر سواری میں گھر جاتیں۔

شاہ عالم کے بعد بھی یہ رسم قائم رہی۔ اکبر ثانی کے وقت میں ان رام کور کی بیٹی راکھی بندھن باندھنے اور اپنا نیگ لینے آتیں۔ بہادر شاہ نے بھی اس سلونو کو باقی[ل] اور اس سے ہندو مسلم رشتہ کو قائم رکھا۔ مگر فلک کو اس کا باقی رکھنا منظور نہ تھا۔ بہادر شاہ، دلّی سے کیا گئے کہ ساری برکت گئی اور اب تو راکھی بندھن بندھنا کیسا، ہندو مسلمان، کلائی نہیں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے اور اپنی جگ ہنسائی کرا رہے ہیں!!

ادھر تو سلونو کی تیاریاں ہو رہی اور اس بڑے تہوار کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں اور ادھر غدّاروں کو بادشاہ کا یہ معمولی جشن بھی نہیں بھاتا اور بے دردوں کا قافلہ محل میں گھس آتا ہے۔ اب روہیلے

ل وداعِ ظفر از مولوی راشد الخیری دہلوی۔

قلعہ کے مالک اور دیوانِ خاص کے بادشاہ ہیں۔ سندھیا (راجہ) نے بادشاہ کی حفاظت اور انگریزوں نے لاکھ حمائت کی مگر جب تک وہ دلّی آئیں آئیں، غلام قادر کور نمک نے اپنے آقا کی نقدِ بصارت بھی لوٹ لی۔ مشکلوں سے بادشاہ کی جان چھوٹی۔ حواس درست ہوئے تو اپنا مرثیہ لے بیٹھے۔ اس کی زبان، اسکے درد اور مغلئی طرزِ ادا کو دیکھو اور سر دھنو۔ فرماتے ہیں۔ ؎

عجب حادثہ برخاست پئے خواریِ ما ✤ داد برباد سر و برگِ جہانداریِ ما
چشمِ من کند شد از جورِ فلک بہتر شد ✤ کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما
داد افغان[۱] بچہ شوکتِ شاہی برباد ✤ کیست جز ذاتِ خدائے کہ کند یاریِ ما
شیر دادیم بہ افعی، بچہ را پروردیم ✤ عاقبت گشت بہ جورِ پئے خواریِ ما
گل محمد کہ ز مروان بہ شرارت کم نیست ✤ چہ قدر کرد وکالت بہ گرفتاریِ ما
ہم الہ یار و سلیمان و بدل بیگ لعیں ✤ ہر سہ بستند کمر بہرِ دل آزاریِ ما
مادھوجی سندھیا فرزندِ جگر بندِ من ✤ ہست مصروف تلافیِ ستمگاریِ ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دل سوزِ من اند ✤ چہ عجب گر بہ نمائند مددگاریِ ما

---

[۱] یہ افغان بچہ یعنی غلام قادر ملعون آخر گرفتار ہوا اور کتّے کی موت مارا گیا۔

یہ وہی شاہی ادبی مذاق کا شہرہ تھا جو سید انشا[1] کو مرشد آباد سے دلّی کھینچ لے جاتا ہے۔ یہاں پہونچتے، حضور میں حاضر ہوتے اور اپنے زورِ زبان سے تخت کے پاس جگہ پاتے ہیں۔ شعر و شاعری کے پھول جھڑتے اور دربار میں اردو کے کنول کھلے رہتے ہیں۔

اتنے میں مرزا راجہ رام ناتھ[2] (مصاحب بادشاہ) حاضرِ دربار ہوتے اور اپنے آفتاب کے آگے ذرّہ بن کر بہ ادب بیٹھتے اور انشا کی چھیڑ پر جب اپنا یہ شعر ؎ غضب ہے آکے عاشق کو لٹا دیتی ہیں لال آنکھیں ؎ چھنا لیتی ہیں میری جان وہ کافر چھنال[3] آنکھیں۔ حضور میں عرض کرتے ہیں تو بادشاہ مسکراتے اور سید انشا عرض کرتے ہیں۔ کہ "پیر و مرشد

---

[1] سید انشا مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دلّی گئے۔ پھر وہاں سے لکھنؤ آئے اور وہیں مرحوم ہوئے۔ ان کے حالات سے تذکرے بھرے ہیں۔ [2] مرزا راجہ رام ناتھ عہدۂ نظارت حضور والا (شاہ عالم) پر مامور تھا۔ اگرچہ ہندو تھا مگر ایام محرم الحرام میں تعزیہ بناتا اور سبز پوش رہتا اور شربت لوگوں کو پلواتا اور خیرات کرتا۔ بہرکیف ایک مرد تھا صاحب ثروت، عمدہ معاش، نیک فطرت۔ بہ سبب موزونی طبع کے گاہ گاہ فکر ریختہ بھی کرتا اور چونکہ شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا اس لئے اپنا تخلص ذرہ رکھا تھا۔ یہ شعر اُس کا ہے ؎ تیرے کوچہ میں روز و شب پڑا رہتا ہی یہ ذرہ ؎ بجا ہے ایسے دیوانہ کے مطلب کو روا رکھنا (تذکرۂ اردو شعرائے ہند۔ از منشی کریم الدین پانی پتی)
[3] چھنا۔ چھینا۔ اور چھنال۔ چھیننے والا۔ یہ پرانی زبان ہے۔ مگر اب اس لفظ کے معنی اور ہو گئے ہیں۔

اب کے پھول والوں[۱] میں یہ مطلع جھولوں سے زیادہ اُچھلا اور بہت سوں سے مرزا کے پینگ بڑھ گئے"! دربار اس پر ہنس پڑتا اور راجہ شرما جاتے ہیں۔ لطائف و ظرائف کی یہ پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں کہ راجہ گوپال ناتھ[۲] کو حضوری ہوتی ہے۔ یہ مرزا راجہ (ذرّہ) کے فرزند اور اپنے ولی نعمت کے غلام اور ان کے فدائیوں میں سے ہیں۔ راجہ گوپال حاضر ہوئے۔ اپنے منصب سے بیٹھے۔ سید انشاء نے انھیں دیکھتے ہی کہا کہ "واہ بھئی خوب آئے۔ ذرا پہلے آتے تو پھول والوں کی سیر بھی دیکھتے"! یہ کہہ کر ایک انداز سے مرزا راجہ کی طرف اشارہ کر کے سید انشاء نے ان کا وہ شعر پڑھا۔ پھر ایک ہنسی ہوئی اور راجہ گوپال نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ انشاء نے پھر کہا کہ "مرزا کچھ سناؤ"۔ شاہی اشارہ بھی ہوا۔ یہ آداب بجا لائے۔ ایک غزل شروع کی۔ پڑھتے پڑھتے جب اس شعر

خط دے تو نہ دے گوش بر آواز ہیں قاصد ؛ مژدہ تو ہمیں یار کے آنے کا سنا دے

---

[۱] دلی میں پھول والوں کی سیر ایک میلا ہوتا تھا جہاں شوقین جاتے اور وہاں طوائفوں کو بھی گھور اکرتے تھے۔ یہ میلا اب بھی ہوتا ہے۔ [۲] غلام تخلص۔ راجہ گوپال ناتھ نام خلف مرزا راجہ رام ناتھ ذرہ۔ ایک امیر مقرب شاہ عالم سے تھا۔ اس واسطے وہ غلام تخلص کیا کرتا تھا (تذکرۂ اردو شعرائے ہند۔ از منشی کریم الدین پانی پتی)۔

پر پہونچے تو سید انشا بھی چونکے۔ کہا کہ "مرزا حاصل غزل یہ شعر ہے"! بادشاہ نے بھی سر مبارک ہلایا۔ غلام، سرو قد کھڑے ہوگئے اور فراشی تسلیم بجالائے۔

خواجہ میر درد بھی اسی اٹھتی بزم کے ایک چراغِ ہدایت ہیں ان کی خانقاہ میں اردو کی آواز جس طرح گونجی اسے سب جانتے ہیں۔ اور یہ وہی دلکش صدا تھی جس نے شاہ وقت (شاہ عالم) کو بھی عندلیب (خواجہ ناصر والدِ بزرگوارِ میر درد) و درد کے تکیوں تک کھینچا۔ بادشاہ اپنے ان بے غرض فقیروں تک آتے، بے تکلف ملتے، شریک بزم رہتے اور خوش خوش سدھارتے۔

مذہب کا مبارک ہاتھ بھی اردو کے سر پر اسی یادگار وقت میں رکھا گیا۔ مولانا شاہ ولی اللہ[1] صاحب علیہ الرحمہ نے ۱۱۵۰ھ میں قرآن کا ترجمہ گو فارسی میں کیا مگر ان مرحوم نے بھی اردو کے بڑھتے ہوئے زور کو آخر تسلیم کرلیا اور اشتیاق تخلص اختیار کرکے اس زبان کو بھی پاک اور اس کے مشتاقوں کو فرحناک کرنے لگے!

---

[1] جناب شاہ صاحب نے ۱۱۷۶ھ میں رحلت کی (تذکرۂ گلزار ابراہیمی)

شاہ عالم کا زمانہ بدبختیوں کے ساتھ اردو کی خوش بختی کو بھی یاد دلاتا اور ایسے گدانواز شاہوں کے ناموں پر فاتحہ کے ساتھ حافظ کا یہ شعر بھی پڑھوا دیتا ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد ز عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

جہاندار شاہ اور اردوئے معلّٰی

عالمگیر ثانی کے وقت تک دلّی کا آدمی اپنے گھر سے نکلتا نہ تھا۔ ہمہ شما کا جب یہ رنگ ہو تو وہاں کے امیر زادے اور خصوصاً شہزادے اپنا محل کیا چھوڑتے۔ مگر شاہ عالم کے وقت میں زمانہ بدلا اور یہ وضع بھی بدلی اور اب قلعہ کے مالک تک ملوک ہونے لگے!

جہاندار مرزا، شاہ عالم کے فرزند ہیں اور ولی عہد۔ شہزادے کا مزاج دلّی میں ناساز رہتا تھا۔ آپ تبدیل آب وہوا کے لیئے سفر کو نکلے۔ لکھنؤ اس وقت، دلّی والوں کا گھر آنگن بن چکا اور انھیں اپنے سرآنکھوں پر جگہ دے رہا تھا۔ پھر بڑی بات یہ کہ وہاں کا رئیس (نواب آصف الدولہ)

بھی اپنے شہزادوں کی خاطرداری کو فخر اور اُن کی خدمت کو اپنی عادت سمجھتا تھا۔

جہاندار خدم وحشم کے ساتھ دلّی سے چلے۔ رستہ میں اُترتے، دم لیتے پورب کو مڑے اور کانپور آئے۔ عمرِ سفر کوتاہ، لکھنؤ پہونچے۔ نواب وزیر کو شقۂ شاہی قبل سے آچکا تھا اور وہ ولیعہد بہادر کی آمد کے منتظر تھے صاحب عالم کے ورود کی خبر سے باغ باغ ہوگئے۔ شہر کے ناکہ پر استقبال کیا۔ اور انھیں خاص ہاتھی پر سوار اور خاصہ کے ہودج میں بٹھا اور خود خواصی میں بیٹھ، چنور ہلاتے، زر وارتے شہر میں اور ان کی فرودگاہ تک لے آئے۔ یہاں وزیر کی عزّت افزائی کی گئی۔ انھیں گیارہ پارچوں کا خلعت، انعام ہوا۔ نواب نے نذر پیش کی اور آداب بجالا کر رخصت ہوئے۔ جب سے، صاحب عالم لکھنؤ میں رہنے لگے۔

جہاندار، شاہ عالم کا بیٹا ہے۔ ادب اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ لکھنؤ میں اس کے آتے ہی اہلِ ہنر کے گھر میں گھی کے (چراغ) جل گئے۔ ہر مہینہ کی چودھویں کو، چاندنی کی بہار اور محفل کا لطف ہے۔ صاحب عالم کے یہاں مشاعرہ ہونے لگا۔ ادیب و شعرا آتے، شہزادہ بھی ایک کی

خاطر رکھتا اور درجہ درجہ سے اپنی بارہ دری میں سب کو بٹھاتا۔ شمعیں جلتیں، کنول روشن ہوتے، اور واہ واہ کے نعروں سے صحبت گرم ہو جاتی!

مرزا علی لطف نے بھی ان محفلوں کا مزا لیا اور اپنے تذکرہ گلشنِ ہند میں اُن صحبتوں کا بہ لطف ذکر کیا۔ اور شہزادے کے حضور میں حاضری کا مزا لے کر تذکرہ کیا ہے۔ کچھ عرصہ تک لکھنؤ میں یہ جشن و عیش رہے پھر صاحب عالم وہاں سے بنارس تشریف لے گئے اور وہیں دنیا سے (۱۲۰۱ھ) کوچ کر گئے۔[۱] نواب علی ابراہیم خاں، صاحبِ گلزارِ ابراہیمی، بنارس ہی میں شہزادے کی خدمت میں باریاب ہوئے اور اس پر وہ عمر بھر نازاں رہے۔

مصحفی کہتے ہیں کہ شہزادہ فاضل اور فارسی میں بھی بند نہ تھا۔ نواب علی ابراہیم تحریر کرتے ہیں کہ صاحب عالم نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا جو اُن کی وفات کے سبب پورا نہ ہو سکا۔ وہ ناقل

[۱] دلّی کے شہزادوں سے بنارس کا ایک محلہ (شوالہ) بس گیا تھا جہاں قلعہ کی اکثر باتیں اب تک مروج تھیں مگر اب وہ محلہ ویران اور شہزادوں کے محل ڈھنڈار پڑے ہیں۔ میں نے اس کے کچھ سمے دیکھے تھے مگر نہ اب وہ دکھانے والے رہے اور نہ دیکھنے والے اور ہم بھی اب جانے والوں ہی میں سے ہیں!

ہیں کہ "وارن ہیسٹنگ (گورنر جنرل) بنارس آئے تو شہزادہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ صاحب عالم نے اپنے شعروں کی ایک بیاض بہ طور تحفہ انھیں دی جو اُن کے ساتھ ولائت گئی اور کمپنی (ایسٹ انڈیا) کے کتب خانہ میں بصد امتیاز محفوظ رہی۔" نواب ابراہیم اور مصحفی نے اپنے اپنے تذکرہ میں شہزادہ کے اکثر اشعار نقل کیے ہیں۔ اِن میں کے چند حاضر ہیں۔ سنو اور اپنے مرشد زادے کی زبان اور اُن کے مذاق پر نظر کرو۔ فرماتے ہیں۔ ؎

مطلع۔ مر کس کے انتظار میں یہ بے اجل گیا ؛ آنکھیں جو یوں کھلی رہیں اور دم نکل گیا

" ۔ کون سی بات تری ہم سے اٹھائی نہ گئی ؛ پر جفا جو تری ناحق کی لڑائی نہ گئی

شعر۔ قصد ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے ؛ طرزِ نالے کی مگر اُس سے اڑائی نہ گئی

مطلع۔ ترے عشق کے جب سے پالے پڑے ہیں ؛ ہمیں اپنے جینے کے لالے پڑے ہیں

ایک مقطع۔ کل جہاندار ہم اور یار تھے ٹک مل بیٹھے ؛ بخت ناساز نے پھر آج بچھڑایا تنہا

یہاں ہم کو تم کو ایسے شعروں میں صرف یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہماری اُردو کی کیا شکل تھی۔ اپنے مطلب کے اظہار میں وہ گونگی تھی یا گویا؟ ہر ملک اور ہر قوم میں وہاں کے

امیروں اور اونچے گھرانے والوں کی زبان سراہی اور اُن کی تقلید کی جاتی ہے۔ شعرا عموماً ان کی سرپرستی میں اپنی زبان صاف کرتے اور پھر اسے پھیلاتے ہیں۔ اردو بھی یوں ہی بنی اور سنوری قلعۂ معلّیٰ کی زبان اُس وقت مانی جاتی اور وہاں کے لفظ لفظ کی تقلید کی جاتی تھی۔ ان مرشد زادے کی صحبت میں لکھنؤ بنا اور وہاں کے ادیب درست ہوئے۔ پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ کی سرپرستی میں مصحفی و انشا اور جرأت نے نام نکالا اور اردو کے استاد سمجھے گئے اس کا قصّہ آگے آتا ہے۔

شہزادہ سلیمان شکوہ اور اردوئے معلّیٰ

بیچارے دلّی والوں پر اب وہ وقت آیا کہ اپنا گھر انھیں کاٹے کھاتا تھا۔ محمد شاہی دور میں وہاں کی آبادی چالیس لاکھ سے اوپر تھی شہر کا نقشہ یہ کہ اسی زمانہ میں نواب آصف جاہ، دکھن سے بادشاہ کی قدم بوسی کو آئے تو لاکھ جوان ساتھ لائے۔ یہ دلّی میں اُترے تو وہاں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اتنا بڑا امیر شہر میں کہاں پڑاؤ ڈالے

پڑا ہے! نادر نے اُسی وقت میں دلّی کا خون بہایا۔ صبح سے دوپہر تک لاکھ آدمی کٹ گیا۔ مگر شہر کا کچھ نہ بگڑا۔ ابدالی (احمد شاہ) آیا تو اُس نے دلّی کا ستھراؤ کر دیا۔ پھر مرہٹے ٹوٹے تو ٹڈی کی طرح شہر کو چاٹنے لگے۔ لیکن دلّی کی ہڈّی کچھ اور تھی۔ وہ ایک طرح کھڑی رہی۔ مگر آئے دن کے اِن جھگڑوں سے اُکتا کر آخر دلّی والے گھر سے نکلنے لگے اور جدھر جس کی سینگ سمائی اُدھر کو چلے اور وہیں کے ہو رہے۔ لکھنؤ پاس تھا اور اُس وقت اُس کی بڑی آس تھی۔ دلّی کا قافلہ وہاں پہونچتا اور آرام لیتا۔

شہزادہ جہاندار مرزا کا ابھی حال سن چکے کہ کس طرح وہ اپنے قلعہ سے نکلے اور لکھنؤ کے بھون میں جا بیٹھے۔ اِن کی دیکھا دیکھی اَب اَور مرشدزادے بھی اپنے محل چھوڑ چھوڑ کر اور اور جگہ جا بسے۔ اِن شہزادوں میں مرزا سلیمان شکوہ وہ عالی مرتبہ مرشدزادے ہیں جو دلّی کو سلام کر کے لکھنؤ آئے اور وہاں شاہی کرتے رہے۔

یہ بھی شاہ عالم کے فرزند اور سلطنت مغلیہ کے دلبند ہیں۔ آپ لکھنؤ تشریف لائے تو نواب وزیر نے، حسب معمول، اِن کی بھی

آؤ بھگت کی۔ بڑے چاؤ ارمان سے اُنھیں اُتارا اور پھر دریا (گومتی) کنارے ایک بڑا محل خالی کر کے اُس میں لا بٹھایا۔

مرزا سلیمان شکوہ اَب وہاں بے تکلف رہنے اور دلّی والوں کے ساتھ لکھنؤ والوں کے سروں پر بھی ہاتھ رکھنے لگے۔ مصحفی، کہ کچھ پہلے دلّی سے لکھنؤ آ رہے تھے، شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دربار میں لے لیے گئے۔ یہ مرشد زادہ بھی بادشاہ (شاہ عالم) کی طرح ادب کا دلدادہ اور شاعری کا شیدا تھا۔ مصحفی پر قدر کی نگاہیں پڑنے لگیں اور اُن کے کمال پر نظر کر کے، شہزادے نے انھیں اپنا اُستاد بنا لیا۔

مرشد زادہ کی توجہ اور مصحفی کے دم سے اب لکھنؤ میں شاعری کی آواز بلند ہونے اور دلوں کو ادھر کھینچنے لگی۔ میر تقی میر کا حال تو معلوم نہیں کہ ایسی دلکش صدا پر اُن کے کان بھی کھڑے ہوئے کہ نہیں مگر سودا کا ذکر، صاحب عالم کی محفلوں میں سننے میں آیا اور شاید یہ ٹھیک ہے۔ مرزا صاحب کو دلّی سے خاص لگاؤ تھا اس لیے ممکن ہے کہ وہ بھی فیض آباد سے جب لکھنؤ آتے ہوں تو

اپنے مرشد زادے کے سلام کو بھی جانتے ہوں۔ مگر سکندر[1] (خلیفہ محمد علی) مرثیہ گو، جن کا ذکر آبِ حیات میں بڑے آب و تاب سے آیا ہے، وہ بھی اس بزم کے نقلِ محفل[2] بنے رہے کہ نہیں؟ یہ مشتبہ ہے۔ مگر پروفیسر آزاد ان میاں سکندر کو ہمارے مرشد زادے کی صحبت میں پیش کر کے اس سے ایک عجیب لطیفہ تراشتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا،

~ یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر، تو حیران ہوتا تھا کہ

"سکندر کا یہاں کیا کام ہے۔ میر مہدی حسن فراغ کو خدا مغفرت

"کرے، انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسبِ معمول مرزا،

"سلیمان شکوہ کے یہاں پائین باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحبِ عالم،

"خود مسند پر بیٹھے تھے، شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں"

---

[1] یہ سکندر مشہور مرثیہ گو میر گھران کا پنجاب تھا گردتوں دلی میں رہے ہے پنجابی تو خیر لوربی اور مارڑواری بھی اچھی جانتے اور ان میں مرثیے بھی کہتے تھے۔ ملاح وماہی نام ایک مثنوی بھی ان کی مشہور ہے مرثیہ ~ ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول، انھیں کا ہے۔ غزلیں بھی کہتے تھے۔ دو شعر سن لو۔

~ قیس صحرا میں رہا، کوہ میں فرہاد رہا ÷ میں بگولے کی طرح مفت میں برباد رہا ~ نہ دیکھا ہو جو کسی نے حباب دریا میں ÷ وہ دیکھ لے مری چشم پر آب دریا میں (تذکرۂ کریم الدین)

[2] نقل۔ گزک یعنی وہ چیزیں جو شراب کے ساتھ کھائی جائیں اس سے مزہ بڑھ جاتا ہے نقلِ محفل سے مراد وہ ہوتا ہے جو محفل کو خوش اور جولاں رکھ سکے۔ یہ لفظ "نقل" ن کے پیش کے ساتھ غلط طور پر مستعمل ہے۔

"سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ اُن کی
"پرانی وضع اور لباس پر کہ اُن دنوں میں انگشت نما تھی، صاحب عالم
"مسکرائے۔ میر صاحب آکر بیٹھے۔ مزاج پرسی ہوئی حقّہ سامنے آیا۔
"اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد کیجیے (دونوں
"صاحبوں کے معاملات تو اُنھیں معلوم ہی تھے۔ خدا جانے چھیڑ
"منظور تھی یا اتفاقاً زبان سے نکلا) سودا نے کہا۔ میں نے تو ان دنوں
"کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک
"مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا۔ کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند
"پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اُٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریبان
"ہو گئے۔ سکندر بچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب۔ یہ کیا آفت
"آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا۔ اور
"سودا کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں (یہ ہے شانِ نزول
"اس مخمس کی)۔ (آبحیات ذکر میر ضاحک۔)

یہ فراغ (جو اس داستان کے راوی بتائے گئے) بھی ایک عجیب ستم ظریف ہیں۔ مگر آزاد پر عجب ہے کہ اُنھوں نے اپنے زمانہ میں بھی دلّی اور لکھنؤ کے

شرفا کو دیکھا اور ان کی تمیزداریوں کو نگاہ رکھا ہوگا۔ اس پر وہ ایک ایسا قصہ بیان کر گئے۔ اسکندر کو میں نہیں جانتا۔ مگر ضاحک کو پہچانتا اور اُن کے خاندان سے واقف اور اُن کے گھر کی شرافتوں سے آشنا ہوں۔ اس لیے میں کہوں گا کہ یہ حکایت از سرتاپا لغو ہے۔ اول تو میاں سکندر کا لکھنؤ جانا ہی ثابت نہیں۔ پھر یہ کہ ضاحک کے سے بزرگ کسی صحبت میں شریفوں سے یوں ہاتھاپائی کر بیٹھیں! اس پر مزید یہ کہ یہ واردات مرزا سلیمان شکوہ کے سے مہذب شہزادے کی ایک صحبت میں ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد مرحوم کے وقت میں دلی کے اُمرا کی صحبتوں کا کیا قرینہ ہو گیا تھا۔ اور ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے زمانہ میں کیا دیکھا۔ مگر جس وقت کا قصہ اُنھوں نے چھیڑا ہے اس زمانہ کا ہمارا کوئی امیرزادہ اتنا بے قرینہ نہ تھا کہ اُس کی صحبت میں دو شریف یوں گتھم گتھا ہو جائیں! ہمارے آزاد اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے اور اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے ہیں۔ اِن ہی میر ضاحک اور سودا کے ذکر اور اُن کی ہجووں کے سلسلہ میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

"میر حسن اِن (ضاحک) کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے [illegible]

"میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لیئے گئے اور اپنا
"دیوان ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر
"جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیئے اور
"کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا تم فرزند ہو جو کچھ ما
"اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی، معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر
"سے دیوان منگوا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں
"میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت
"دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں"

اس داستان میر حمزہ کو سمجھنا چاہو تو اسی آب حیات میں ان میر ضاحک
کے ذکر سے کچھ قبل سودا کا حال پڑھو آپ فرماتے ہیں کہ۔

"جب تک مرزا زندہ رہے نواب مغفرت مآب اور اہل لکھنؤ کی
"قدردانی سے ہر طرح فارغ البال رہے۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر
"میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں دنیا سے انتقال کیا"

اتنا پڑھنے کے بعد اب پھر ذرا میر ضاحک کے ذکر پر نظر کرو۔ وہاں آپ
ارشاد کرتے ہیں کہ۔

"ان کی تاریخ وفات بھی معلوم نہ ہوئی۔ ممکن نہیں کہ باکمال صاحبزادہ نے تاریخ نہ کہی ہو۔ مگر آزاد کو کون بتائے۔ صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ فیض آباد میں ہیں اور وارستگی سے گذران کرتے ہیں۔"

پروفیسر مغفور کی خود تحریر کے مطابق (اور یہ صحیح ہے) سودا نے ۱۱۹۵ھ میں قضا کی۔ اور پھر انھیں کے نوشتہ کے بہ موجب (اور یہ بھی ٹھیک ہے) میر ضاحک ۱۱۹۶ھ تک جیتے تھے۔ یعنی سودا نے ضاحک سے ایک برس پہلے انتقال کیا! پھر یہ تعزیت بیٹھکی کیونکر ہوگئی ؟! آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں اس لیئے وہ تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابل معافی ہیں۔ مگر تذکرہ کی غلطیاں اور پھر اس طرح کی داستان سرائیاں لائق معافی نہیں۔ جہاں سودا و ضاحک کا ذکر یوں ڈھٹائی سے بیان کر دیا گیا ہو وہاں اور قصوں کہانیوں کے ساتھ، مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں کی ایک صحبت اور ضاحک و سکندر کی اس روائت کا گڑھ دینا کیا بڑی بات ہے!

شہزادے کے یہاں یہ محفل گرم ہے کہ سید انشا دلّی سے لکھنؤ آتے اور بادشاہ (شاہ عالم) کے نمک کا پاس کر کے اپنے مرشد زادہ سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے کہ مصحفی کے اور ان کے چھینٹی اور دونوں استادوں کے شاگرد اور طرفدار شہر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ صاحب عالم اس ہنگامہ میں شاید انشا کا پاس کر جاتے ہیں۔ مصحفی کے دل کو اس سے چوٹ لگتی ہے اور بے بس ہو کر اس کا پھپھولا توڑتے اور یہ دو شعر شہزادے کے حضور میں گذار کر گھر بیٹھ رہتے ہیں۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں ؛ کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہی اس شہر میں رہنا ؛ سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

صاحب عالم نے اپنے بڈھے کے آنسو پونچھنا چاہے مگر انشا کے آگے کسی کی کیا چلے۔ مصحفی آخر اس بزم سے اٹھے اور سید انشا نے ان کی جگہہ لی اور میاں جرأت کو اپنے ساتھ رکھ کر سلیمانی محل کے کنگرے ہلاتے رہے۔ لکھنؤ نے چند دن یہ مزے اور سمے بھی دیکھے۔

نواب سعادت علی خاں اب نواب وزیر ہیں۔ وہ آصف الدولہ نہ تھے کہ سب سمجھتے اور چپکے بیٹھے دیکھا کرتے۔ شہزادے کے

لکھنؤ میں قیام کی وجہ سے خلقت اُدھر ٹوٹتی اور مرشد زادہ کے رہتے وزیر کو نہ پوچھتی۔ سعادت علی خاں کو یہ رنگ ناگوار ہے اور فکر میں ہیں کہ کسی طرح سلیمان شکوہ شہر سے جائیں کہ ان کی وزارت و امارت کی لوگ خیر منائیں۔ ریشہ دوانیاں کیں اور انگریزی ریزیڈنٹ کو ملا کر آخر شہزادے کو آگرہ کی راہ سجھائی۔ صاحب عالم بھی اس تجویز کو مناسب وقت سمجھے (کہ وہ شہر "اکبر آباد" بزرگوں کا قدیمی وطن اور دہلی سے نزدیک ہی) اور وہاں تشریف لے گئے۔

سلیمان شکوہ، ذی علم اور پایہ کے شاعر و ادیب تھے۔ مگر کہتے کم اور سنتے زیادہ تھے پھر بھی جو کچھ انھوں نے ارشاد کیا وہ اُس وقت اور اس کے بعد بھی خوش مذاقوں اور زبان دانوں کے 'سر آنکھوں پر' رہا۔ ان کے مختصر دیوان کی بسم اللہ (اول غزل) پڑھنے کے قابل اور اُس کا یہ مطلع وِرد کے لائق ہے ؎

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا توکّلتُ علی اللہِ تعالیٰ

تدبیر سے اٹھا نہ تقدیر سے اٹھا مشکل زمین تھی مگر دیکھنا مشاق شہزادہ اس میں کس زور کا مطلع نکالتا ہے سنو ؎

جنازہ تیرے دیوانہ کا کس توقیر سے اٹھا کہ شور نالہ ہر اک خانۂ زنجیر سے اٹھا

اکبر ثانی اور اُردوئے معلّیٰ

ن اکبر کی شاہی، شاہی نہیں گدائی تھی! شاہ عالم کے ذکر میں سلطنت کے جانے اور سر جھکا کر ان کے قلعہ میں بیٹھنے کا مختصر حال ابھی تم نے پڑھ لیا اور اس سے اتنا سمجھ لیا ہوگا کہ کب سے ہماری مصیبت اور شامت کے دن شروع ہوئے؟! اور یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اِن آفتوں اور بدبختیوں کے ساتھ یہ بادشاہ کیونکر اپنا وقت گذار لے اور کس طرح دن کاٹتے تھے۔

حق یہ ہے کہ یہ مغل بڑا دِل لائے تھے۔ بابر کے حال میں پڑھ چکے ہو کہ جب اُسے دیس نکالا ہوا تو جنگل میں کیونکر منگل مناتا اور آبِ رواں کے کنارے بیٹھا شعر و شاعری سے کس طرح دِل بہلاتا تھا۔ شاہ عالم میں بھی وہی بابری خون تھا۔ وہ لہو جب ہیجان میں آتا تو ادب کی رگوں میں چکر کھاتا اور پھر آہ و واہ بن کر منھ سے نکلتا!

اکبر ثانی بھی آخر مغل ہی تھا۔ سلطنت اس نے نہیں کھوئی۔ ملک اس نے نہیں برباد کیا۔ اس کے ذمّہ دار اور ہیں۔ یہ الزام سے

بری ہے اور بری رہے گا۔ حکومت کی واپسی اس کی طاقت سے اب باہر تھی۔ ہاں جن چیزوں پر اُسے قابو تھا اُنھیں اس سے کوئی چھین نہ سکا اپنے خاندانی آداب کے قائم رکھنے پر اُسے قدرت تھی وہ اُس نے عیاں کر دی اور اپنے بزرگوں کے دربار کی ایک جھلک بھی اُس نے دکھا دی۔

اس خاندان کے جہاں اور آداب تھے وہاں دربار کا آداب بھی مشہور اور وہ بڑے قاعدوں سے برتا جاتا تھا۔ بادشاہ تخت پر جلوہ گر ہیں۔ اس کے نیچے لیے اپنے عہدے اور منصب سے وزیر و امیر دو رویہ ہاتھ باندھے بُت بنے کھڑے ہیں۔ دہنی طرف امیروں کی قطار ہے اور بائیں جانب شہزادوں اور مرشد زادوں کی صف۔ درباری گھنٹوں اسی طرح کھڑے رہتے اور ہل نہیں سکتے تھے۔ تخلیہ اور خاص صحبتوں میں وزیروں اور اونچے امیروں کو البتہ بیٹھنے کی اجازت ملتی اور یہ بڑی عزت سمجھی جاتی۔ مگر بادشاہ کے سوا پیچوان کسی کے آگے نہ لگتا۔ محمد شاہ نے اس قاعدہ کو ذرا بدلا۔ اس کے عہد میں اوّل درجہ کے امیروں کو حقّہ اور کبھی کبھی پان بھی ملنے لگا۔ یہ بڑی عزت افزائی تھی

اس کے حاصل کرنے میں حد کی کوششیں کی جاتیں اور بڑی بڑی رقمیں صرف کی جاتیں۔

اکبر ثانی نے اپنے بزرگوں کے اس داب کو برقرار اور اس شاہانہ طریقہ کو برابر قائم رکھا۔ اس لیئے اُس کا دربار مشہور تھا اور اس میں حاضری کی بڑے بڑوں کو ہوس رہتی تھی۔ جس زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے اُس وقت لارڈ ماٹرا (ہیسٹنگ) یہاں کے گورنر جنرل ہیں۔ انھوں نے بھی اس دربار میں حاضری کی آرزو کی۔ عرض قبول ہوئی تو پرچہ گذرا کہ۔ لاٹ صاحب دربار میں کرسی کے خواہشمند اور اس عزت افزائی کے بھی آرزومند ہیں۔ حکم ہوا کہ "اچھا آئیں۔ عزت بخشی جائے گی"۔ پھر عرضداشت گذری کہ۔ لارڈ ماٹرا یہاں کی حکومت کے افسر ہیں وہ بیچوان عنایت ہونے کے بھی امیدوار اور سزاوار ہیں۔ بادشاہ اس پر خموش رہے مگر سمجھا گیا کہ یہ گذارش بھی قبول ہو گی۔ گورنر جنرل حاضر ہوئے بادشاہ نے اخلاقاً انھیں کرسی عنایت ہونے کا حکم فرمایا کہ ولایت کے امیروں کو وہاں کے درباروں میں کرسی ملتی ہے۔ ماٹرا، آداب

لہ بادشاہوں کو جو عرضی دی جاتی ہے اُسے پرچہ لگنا یا لگانا اور پرچہ گذرنا، گذارنا کہتے ہیں۔

بجالا کر بیٹھے۔ مگر بیچوان سامنے نہ آیا۔ انتظار دیکھتے رہے۔ آخر اجازت لے کر کورنش عرض کی اور رخصت ہوئے۔

ظاہر ہے کہ بادشاہ اُس وقت کمپنی کے وظیفہ خوار ہو چکے اور ان ہی گورنر جنرلوں کی مہربانیوں پر گذارہ کر رہے تھے۔ مگر یہ اکبر اس معاملہ میں دوسرا عالمگیر تھا۔ وہ اپنے داب سے سر مو نہ سرکا۔ لاٹ صاحب کو خفت ہوئی۔ بیچوان نہ ملنے پر پیچ و تاب کھاتے رہے۔ بادشاہ تک شکایت پہنچی۔ مگر حضرت نے پروا نہ کی۔ مائرا یہ ملال دل میں لیئے رہے اسی سفر میں دلی سے جب لکھنؤ آئے تو وہاں اس کے بدلہ لینے کا نقشہ تیار کرنے لگے۔ یہ غازی الدین حیدر کی وزارت کا زمانہ اور آغا میر کی نیابت کا وقت ہے۔ مائرا نے ان نائب صاحب کو ملایا اور وزیر الممالک کو شاہ اودھ[1] بنانے کا شگوفہ چھوڑ دیا۔ اس قصہ کو اودھ اور اردو کے باب میں پڑھنا وہاں زیادہ مزا آئے گا۔

اس اکبر کو دوسری قدرت اپنی مادری و ملکی زبان کو قائم رکھنے بلکہ اس کے بڑھانے پر تھی، وہ بھی اُس نے دکھا دی۔ اردو اس کے

---

[1] تاریخ اودھ از میرزا کمال الدین۔

وقت میں دیکھتے دیکھتے بہت آگے بڑھ گئی تھی اور اب ایک دلی ہی زبان کا مرکز نہیں رہی تھی بلکہ لکھنؤ اس کا دوسرا گھر بن چکا اور عظیم آباد بھی اس کا تیسرا گھر بن رہا تھا۔ ملک میں اس کی آواز پھیل چکی اور پنجاب سے بنگالہ تک اس کی خوش آئند صدا چھا چکی اور زمین دکھن بھی اپنے آغوش محبت میں اسے جگہ دے چکی تھی اس لئے اس کی ترقی کا ذمہ دار ایک شاہ دہلی ہی نہ تھا۔ مگر ادب کے اس شیدائی اور اپنی خاندانی باتوں کے اس فدائی نے اپنے بزرگوں کی طرح اپنی اردو کو بھی اپنے تخت کے پاس اونچی کرسی دی۔ یہ شاعروں اور ادیبوں کا قدرداں اور ان کا نگہبان رہا۔ شاہ نصیر اسی کی سرکار سے بنے اور میاں ابراہیم (ذوق) اسی کے دربار میں بار پاکر خاقانی ہند مانے گئے۔ دلی کا کیا ذکر باہر کے آدمیوں پر بھی نظر رکھتا اور جب کوئی باکمال دار السلطنت میں آجاتا تو انھیں سرفراز کرتا۔

مراد شاہ ایک مشہور پنجابی، اردو گو شاعر جب پورب کے سفر سے لوٹ کر دلی آتے ہیں تو بادشاہ انھیں یاد کرتا اور ان کا کلام سن کر خوش ہوتا اور انھیں انعام اکرام دیتا ہے[۱]۔ یہ وہی استاد مراد ہیں جنھوں نے چہار درویش (فارسی) کو اردو نظم کا جامہ پہنانا چاہا تھا۔ زندگی نے وفا نہ کی۔ قصہ ادھورا رہ گیا۔

[۱] تذکرۂ گلزار ابراہیمی۔

اِن کی صاف و فصیح اُردو بھی سُن لو۔

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا | اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
ولیکن ہو اُردو زباں میں بیاں | کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں

مراد اُردو پر فریفتہ تھے۔ یہ انھیں بزرگوں کا فیض تھا کہ پٹھانوں اور جاٹوں کے شور و شر پر بھی پنجاب اپنی اصلی و قدیم زبان کو نہ بھولا۔ اور انقلابوں کے بعد بھی اس نے اپنی اُردو کو یوں یاد رکھا۔ یہ زبان وہاں اب بھی جوان اور ہمارے زندہ دلان پنجاب کی جان نظر آتی ہے! مراد شاہ کے سے اہل نظر نے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنی اردو کی نسبت جو فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ اپنے نامۂ مراد میں کہتے ہیں۔

وہ اُردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے | کہ جس کا قائل اَب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھسے میں، ہندی زباں میں | کروں شہرت ہو تا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں | سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں،
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں؛ | کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں،
اُسی کا شہرا اب ہو جائے سب تک | یہاں سے تا بہ ایران بل عرب تک
خصوصًا شعر، اَب شاعر یہاں کے | نہیں کہتے، بجز ہندی زباں کے

غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے
کہ شعر فرس مطعونِ جہاں ہے

یہ شہرت ہے اب اس مضمونِ پُر کی
نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی

نہیں ہندی سخن میں نقص ممکن
لطافت ہے بہت سی اس میں لیکن

نہ شاعر ہند کے یوں فی الحقیقت
گئے لے فرس کے مضموں پہ سبقت

جھنجھوڑا فارسی کے استخواں کو
کیا پر مغز تب ہندی زباں کو

فصاحت فارسی سے جب نکالی
لطافت شعر میں ہندی کے ڈالی

جناب شاہ صاحب نے ۱۲۵۱ھ میں وفات پائی۔

اس میں شک نہیں کہ پنجاب نے اگر غزلوں کے پھولوں سے اپنی پگڑیاں نہ سجائیں اور نمائشی گلوں اور بلبلوں کو اپنے شالا ماروں میں جگہیں نہ دیں تو انھوں نے (زمین دکھن کی طرح) اپنے باغوں میں اخلاق کے وہ گل کھلا دیے جن کی خوشبو وہاں سے اڑ کر دور دور پہونچی اور ہمارے ان پانچ دریاؤں (پنج آب) سے ٹکرائی آخر دوآبہ[ل] میں آ بسی! یہ اُن پنجابی نظموں کا اثر تھا کہ آگرہ میں بھی ایک بے نظیر معلّم پیدا ہو گیا۔ ہمارے یہ نظیر (شیخ ولی محمد) اسی اکبری دور کے وہ شیخ وقت ہیں جنھوں نے اکبر آباد میں بیٹھ کر اپنی زبان کو

ل پنجاب کے پورب اور گنگا و جمنا کے بیچ کی زمین دوآبہ کہلاتی ہے۔

عوام کے منھ میں بھی ڈال دیا اور اپنے بنجارے نامہ اور اپنی دوسری نظموں سے ہند کے بزاروں کو مالا مال کر دیا۔

اردو نظموں کا یہ صوفیانہ رنگ ملک میں آخر سرسبز ہونے لگا۔ مولانا محمد ابراہیم خوش دل بھی اسی دلدوز زمانہ کی یادگار ہیں۔ ان کی ایسی نظمیں بہت مشہور اور مقبول ہوئیں۔ مولانا کا وطن پنجاب ہے۔ ان کا یہ پنجابی چرخہ اس وقت سارے ملک میں چلا۔ عظیم آباد اور ہمارے گھر کی بڑی بوڑھی ددائیں اور اَنائیں تک اس عجیب چرخہ کو کاتا کرتیں اور بچوں کو بہلاتی رہتیں۔ اس نظم میں دُنیا پیر زال یعنی ایک بڑھیا تصور کی گئی ہے۔ اور چرخہ آدمی کا جسم فرض کیا گیا ہے۔ بڑھیا اپنا چرخہ لیئے بیٹھی چلاتی ہے اور اس کی چرخ چوں سے یہ نصیحت بھری آواز سننے میں آتی ہے۔ سنو۔

نظم

عِشق کے غم سوں ہو محزوں، آہ یہ دُنیا سب مکر و فسوں
جوں توں چاہے قادر کوں، اس عالم سوں ہوں بیروں
کدھر کی بڑھیا، کہاں کا توں   چل رے چرخے چرّخ چوں!
نابود سبھی آہ ہستی ہے، بنیاد فراموش ہستی ہے

کیا دولت خواب کی مستی ہے، مت کر اتنا شور و جنوں
کدھر کی بڑھیا، کہاں کا توں   چل رے چرخے چرّخ چوں !
کدھر گئے مہتر یعقوب، کدھر گئے یوسف محبوب
کدھر گئے طالب مطلوب، کدھر گئے لیلیٰ مجنوں
کدھر کی بڑھیا، کہاں کا توں   چل رے چرخے چرّخ چوں !
بلبل گلزارِ خدا کا ہو، قمری شمشاد فنا کا ہو
اب تارک حرص و ہوا کا ہو، آہ خوب نصیحت ہے تجکوں
کدھر کی بڑھیا، کہاں کا توں   چل رے چرخے چرّخ چوں !
آہ یہ دنیا ہے سفر سرائے، غافل ہو مت آنکھ لگائے
پونجی کھوئی چلے پچھتائے، پھر نہیں آوے ہاتھ کبھوں
کدھر کی بڑھیا، کہاں کا توں   چل رے چرخے چرّخ چوں !
خوشدل قسمت پر قانع ہو، ہنکار سوں دل کو مانع ہو
تو جی سے فدائے صانع ہو، کس سوں کیا مطلب تجکوں
کدھر کی بڑھیا کہاں کا توں   چل رے چرخے چرّخ چوں !

دیکھنا پنجاب نے اپنی زبان سے کیا کام لیا ہے۔ اس خطہ میں اُس وقت

ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئیں۔ پنجاب اور اردو کے باب میں ان نظموں کو دل لگا کر پڑھنا۔

پنجاب کو یہاں کی جہاں اور باتوں میں اوّلیت حاصل رہی وہاں مذہبوں، پنتھوں اور مّتوں کی ایجاد کا سہرا بھی اسی کے سر رہا ہے۔ کبیر پنتھی اور نانک شاہی فرقے اسی زمین کی پیداوار ہیں جو مدتوں یہاں سرسبز و شاداب رہے ہیں بھائی اور دادو پنتھی البتہ پورب کی خاک سے اٹھے مگر وہ زیادہ جیتے نہ رہے۔ کتابوں کے سوا ان کا ذکر تک اب زبانوں پر نہیں آتا۔ وہ مرے اور اب نیا جنم لینے والے نہیں!

مسلمانوں کی آمد نے اس ملک کے مذہبوں میں ہیجان بلکہ ایک انقلاب ڈال دیا تھا۔ یہاں کے بہتیرے مت یا تو اسلام کا زور روکنے کھڑے ہو گئے یا اپنے آریا اور اُس سامی مذہب کے بیچ میں ایک واسطہ بنے رہے۔ کبیر نانک بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں بلکہ اُن سے بھائی چارا کرتے رہے تھے۔ اور اگر سیاسیات کا سبز قدم بیچ میں نہ آجاتا تو یہ ملک اب تک کسی ایک مذہب کا نام لے کر الّا اللّٰہ[1] کا نعرہ مار کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

---

[1] یہ پہونچے ہوئے فقیروں کا نعرہ ہے۔

انگریزوں یعنی عیسائیوں کی آواز ہمارے ملک میں زیادہ تر مغلوں کے زمانہ میں اٹھی۔ مگر وہ کمزور تھی اور کمزور رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں البتہ وہ آگے بڑھی۔ بودھ مذہب کو کھوکر، بنگالہ، ایک عجیب انتشار میں تھا۔ اُس خطہ کا واقعی کوئی اپنا مذہب نہ رہا تھا۔ اس لیئے عیسائیت نے وہاں زور پکڑا۔ بنگالی اپنے ملک و قوم کو اس شامی مذہب کی طرف کھچتا ہوا دیکھ کر چلا اٹھے۔ مگر ان میں کوئی ایسا سورما ایک عرصہ تک کھڑا نہ ہوسکا جو اُس طوفان کا مقابلہ کرسکتا۔

خدا رحمت کرے راجہ رام موہن رائے پر کہ اگر وہ اُس وقت بنگالیوں کے گرو نہ بنتے تو بنگالہ کسی ایک خدا کے عوض، تین تین خداؤں کی نازبرداری کرنے لگتا! راجہ رام بنگالہ کے مشہور قصبہ بردوان کے ایک قریبی گاؤں رادھا نگر (۱۷۷۲ء) میں پیدا ہوئے۔ رام کنت[1] ان کے باپ مرشد آباد میں پلے اور مسلمانوں کے زیر اثر رہ چکے تھے۔ بردوان کو ایک مدت سے مغلوں اور دہلی ہی سے نیاز حاصل نہ تھا بلکہ وہ مقام شیر افگن خاں اور نور جہاں کی آرام گاہ بھی رہ چکا تھا اس وجہ سے اُس جگہ کی بود و باش ایرانی اور وہاں کی زبان اب تک پرانی (فارسی) تھی۔ پلاسی کو گئے ہوئے ابھی کل

---

[1] یہ ۱۸۰۳ء میں سرگ باشی ہوئے۔

پندرہ برس ہوئے تھے۔ اس لیئے بنگالی، ہندوستانی بنے ہوئے اُردو، فارسی بول رہے تھے! رام کنت جی نے اپنے ان ہونہار فرزند کو ملکی زبان، سکھانا پڑھانا چاہی۔ دہلی و لکھنؤ کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) اُس وقت علم و زبان کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ رام موہن وہاں تعلیم کے لیئے بھیجے گئے۔ اُنھوں نے عربی، فارسی پڑھی اور اُردو سیکھی۔ اس تعلیم نے اپنا اثر دکھایا سولہ برس کی عمر میں بُت پرستی کو سلام کر بیٹھے۔ سمجھے کہ ویدانت اِس سے دور اور اصلی ہندو مذہب اس سے نفور رہے ہے۔ سچائی کی ڈھونڈھ میں نکلے۔ ہمالہ پر چڑھے، اُترے۔ تبت پہونچے کہ وہاں شاید گئوتم جی (بودھ) اپنے اصلی روپ میں مل جائیں۔ مگر وہ آسمان پر جا چکے تھے اور تبت کا میدان بھی اُن سے خالی ہو چکا تھا۔ اپنے ایسے کڑے سفر پر پچتائے اور گھر لوٹ آئے یہاں اس بڑی ہستی کو خود سوچنے اور اُسے ڈھونڈھنے لگے۔ شامی مسلک سامنے تھا اور اِن کے بھائی بند اُسے تسلیم کر رہے تھے۔ نزرتھ کی قربان گاہ (آلٹر) کے آگے یہ بھی کھڑے ہو گئے۔ مگر اُسے سلام نہ کر سکے۔ مطالعہ شروع ہوا۔ آخر اس نتیجہ تک پہونچے کہ ابن مریم کی یہ آواز نہیں بلکہ ان کے حواریوں کا یہ ناقوس ہے! یہ سمجھ کر پیغام عیسیٰ کے نام سے

فارسی میں خود ایک رسالہ شایع کیا جس کا ترجمہ بنگالی اور انگریزی میں بھی ہوا۔ اُن کی اس تحریر نے خیالات بدلے۔ اور رومی عیسائیت کا چڑھا ہوا رنگ اُترنے لگا۔ بعد کو ویدانت کو مختصر کر کے اُسے اردو میں بھی چھاپا۔ وید کے اکثر بیان کو بھی فارسی اور اُردو کا جامہ پہنایا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم کا خدا، وید کے اندر بھی جلوہ گر دکھائی دینے لگا۔ اور موسیٰ و عیسیٰ و محمدؐ کا رب ایک سمجھا گیا۔ رام موہن نے آریا اور شامی و سامی خدا کو دو نہ جانا۔ اُس کے حضور میں جھکے۔ اُسے بندگی کی۔ اور اپنے بھائیوں کو بھی اُس بے نیاز سے نیاز حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بنگالی ان کی طرف جھکے اور انھوں نے ایک سماج بنا کر اس واحد اور اصلی قوت کی طرف اُن سب کو جھکوایا۔ اس برہمو سماج (یا خانۂ خدا) کا زور بڑھا۔ غلط عیسائیت سے دل پھرے اور صحیح ویدانیّت، صحیح عیسائیّت اور صحیح وحدانیّت یعنی اسلامیّت کی جانب ان کے مُنھ پھر گئے!

صدیوں کے بعد ہند میں ایسا انقلاب ہوا تھا۔ ملک میں اس کا غلغلہ بلند ہوا۔ اکبر ثانی، ایک قسمت کے سوا، بہت سی باتوں میں اپنے دادا، اکبر اعظم سے ملتا جلتا تھا۔ جملہ مذہبوں کو ایک نظر سے دیکھتا اور اُن کے

ماننے والوں کو اپنے پاس جگہ دیتا اور اُن کی سنتا۔ بنگالہ کی یہ نئی اور روح افزا خبر صبا کی طرح دلّی بھی پہونچی۔ بادشاہ نے بھی سنی، خوش ہوا، اور رام موہن کو اپنے پاس طلب فرمایا۔ عزّت سے رکھا۔ اور پھر انھیں راجہ کے خطاب سے سرفراز کر کے اپنا مشیر اور سفیر بنایا اور اپنے بعض اہم کاموں کے انجام کی خاطر ان کو ولایت روانہ کیا۔ اِن اکبر نے اپنی خاندانی باتوں کا اس موقعہ پر بھی لحاظ رکھا۔ ایک مسلمان کے عوض وہ اپنے ضروری کام اور اور پارلیمنٹ سے پرچہ پیام کے لیئے وہ ایک غیر مسلم کو چُنتے اور اُس پر اعتماد کر کے اپنے گھر کی گذشتہ تاریخ کو دُہرا دیتے ہیں! راجہ رام موہن رائے ۱۸۳۰ء میں یہاں سے خوش خوش ولائت گئے اور وہاں اپنے بادشاہ کا کام انجام دیتے رہے۔ مگر افسوس کہ وہ انگلستان میں بیمار رہنے لگے اور آج سے ٹھیک سو برس پہلے (۱۸۳۳ء) آخر وہیں سرگ باشی ہوئے۔ بادشاہ نے اپنے جاں نثار کی یہ خبر غم سنی تو بڑا الم کیا، اور ان کا سوگ رکھا! راجہ رام موہن آپ مسافرت میں اپنے ولی نعمت کے نمک کا حق ادا کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی زمین اب تک آپ کو یاد کرتی اور دعائے خیر کے لیئے ہاتھ اٹھاتی ہے! اکبر بادشاہ! ہم آپ کی بے تعصبی کو کیونکر بھول سکتے

اور آپ کے اس وفادار کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔ آپ کی پاک و صاف روح پر بھی فاتحہ پڑھتے اور آپ کو سلام کرتے ہیں۔ قبول کیجئے!

گارسن دی تاسی، مشہور فرنچ (اردو) تذکرہ نویس راجہ کے حال میں لکھتے ہیں کہ "اُن سے مجھ سے اردو میں بھی خط کتابت رہی ہے"! راجہ! کیا یہ سچ ہے؟ مگر ہم اسے کیونکر مان لیں۔ آپ کے بعد تو آپ کے صوبہ کی موجودہ پود، اس ملکی اور آپ کے منھ لگی ہوئی زبان (اردو) پر خار کھائے ہوئے اور اسے آپ کے گھر سے بدر کرنے پر کمر کسے ہوئے ہے!

اردو نثر کی ترقی بھی انہی اکبر کے زمانہ کا یادگار تحفہ ہے۔ میر امّن اسی موسم میں باغ و بہار کا سا چمن لگاتے، اور حیدری (حیدر بخش) اسی اٹھتی بزم میں آرائش محفل، آراستہ کرتے اور میرزا علی لطف بھی اسی خزاں دیدہ زمانہ میں اپنا گلشن ہند (تذکرہ) بہ لطف سجاتے ہیں!۔

ابھی سن چکے ہو کہ مذہب کا مبارک ہاتھ اس زبان کے سر پر کس طرح رکھا گیا۔ اب مذہب نے دونوں ہاتھ سے اُسے مضبوط پکڑا۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب اشتیاق، علیہ الرحمتہ نے ۱۱۵۰ھ میں قرآن پاک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ مگر اب پچاس برس کے اندر اندر اردو نے فارسی کی جگہ لے لی

اُن کے صاحبزادہ جناب شاہ عبدالقادر صاحب نے اس دور میں اپنی ملکی زبان کے بڑھتے ہوئے زور کو دیکھ کر اب اس کلام کے معنی اُردو میں بیان کرنا شروع کیئے۔ اپنے اس ترجمہ کے دیباچہ میں وہ کہتے ہیں۔ کہ

'الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان'
'گویا کی اپنے نام کر، اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر، اور امت'
'میں کیا اپنے رسول مقبول کی جو اشرف الانبیا اور نبی الرحمۃ جس'
'کی شفاعت کے امیدوار ہیں ہم، کہ پاویں دو جہان کی نعمت،'
'الٰہی اس نبی امت پر ور کو اپنی رحمت کامل سے درجات اعلیٰ'
'نصیب کر جو نہ حد ہو کسی مخلوق کی اور اپنی عنایت اُن پر ہمیشہ افزوں'
رکھ دنیا اور آخرت میں۔' (موضح القرآن، ۱۲۰۵ھ)

بہادر شاہ اور اردوئے معلّیٰ

بہادر شاہ کی تخت نشینی پر آہ اور واہ دونوں طرح کے نعرے بلند ہوئے! وہ قلعہ کے مالک بنے۔ مگر نہ اب وہ قلعہ ہی دلّی کا مالک تھا اور نہ دلّی ملک کی ملکہ باقی تھی۔ چالیس پچاس برس پہلے جس شہر کی نسبت لکھنؤ میں یہ شعر ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

پڑھ گئے ہوں اور جنھیں سن کر آنسو نکل پڑے ہوں، وہ اب (۱۸۳۷ء) کس عالم میں ہو گا؟ اُسے وہی بتا سکتا ہے جس نے اس کی بہار و خزاں دونوں دیکھی ہو۔

مغلوں کا یہ آخری چشم و چراغ اپنے بزرگوں کی جگہ اُس وقت تخت پر بیٹھا کہ دیوان عام کیسا، دیوان خاص تک گل ہو چکا تھا۔ ہاں، اُجڑے شاہجہاں آباد میں ذرا روشنی نظر آجاتی تھی۔ چاندنی چوک[۱] لٹا نہ تھا۔ اُسکی چوپڑ والی نہر

[۱] چاندنی چوک کی یہ نہر شاہجہاں کے وقت میں نواب علی مردان خاں لائے۔ وہ چوک ہی کی نہیں سارے شہر کی ناک تھی مگر انگریزی میں یہ ناک بھی کٹ گئی!

لہرا لہرا کر فلک کو آئینہ دکھا رہی اور اس کے ستاروں سے اپنی گود بھر رہی تھی۔ سقّے اب بھی للکارتے اور اپنے کٹورے بجا بجا کر پکارتے تھے کہ یخ ہو گیا ہے آب، ہوا شام کی ٹھا کر، پیاسا جو ہو ٹھنڈا وہ کلیجہ کرے آکر۔ جمعہ مسجد کی سیڑھیاں ابھی ٹھنڈی^ا نہیں ہوئی تھیں۔ شام کو بازار گرم ہو جاتا اور ایک میلا لگ جاتا۔ اغل بغل سے کوئی نہ کوئی بڈھا لکڑی ٹیکتا آنکلتا اور اپنی بولیوں ٹھولیوں سے خلقت کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اور اس کے گرد ایک ٹھٹ لگ جاتا۔ اردو بازار^۲ اس کی بغل میں تھا۔ دوکانوں کی سجاوٹ، دوکان داروں کی لگاوٹ اور خریداروں کا جمگھٹ دیکھنے والوں کو پرانا وقت یاد دلاتا اور بے ساختہ منھ سے نکل جاتا۔ کہ ؎

جس کی یہ پیری ہے کیا ہوگی جوانی اس کی

---

۱ ٹھنڈا ہونا بمعنی گرنا، ٹوٹنا، حالت کا بدلنا، جیسے محرم کے علم کی نسبت یہ فقرا۔ دیکھنا مضبوط پکڑے رہو، کہیں علم ٹھنڈا نہ ہو جائے یعنی گر نہ جائے۔ یہاں ٹھنڈا ہونا تعظیم کے خیال سے کہا گیا۔ چوڑیاں ٹوٹتی ہیں تو عورتیں وہم کے خیال سے ہمیشہ یوں کہیں گی کہ۔ چوڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ جمعہ مسجد کی سیڑھیاں بھی عظمت رکھتی ہیں اس لحاظ سے ان کے خالی ہو جانے کو ٹھنڈا ہونا کہا گیا۔

۲ اردو بازار بھی غدر میں لٹ گیا۔ وہاں اب انگریزی میدان ہے۔

بادشاہ کبھی کبھی اپنے شہر کی سیر کو بھی نکل آلتے تھے۔ بوچے یا ہوادار میں سوار ہیں۔ چوبدار، عصابردار، ماہی مراتب والے اور ہرکارے ہم رکاب ہیں۔ در دولت سے سواری چلی اور ڈنکے پر چوٹ پڑی۔ نقیب آگے آگے بولتے اور "سواری ہے جہاں پناہ کی۔ ادب سے، قاعدہ سے، نگاہ روبرو" کی کڑکتی صدا لگاتے آگے بڑھے۔ شہر میں شاہی آمد کی دھوم ہو گئی۔ خلقت ٹوٹی اور سرِ راہ ایک بھیڑ لگ گئی۔ زمین دوز سلام ہونے اور دعاؤں کے نعرے آسمان ہلانے لگے۔ بادشاہ ہر ایک کا سلام لیتے، مسکراتے اور اپنے بزرگوں کی رعیت پر نگاہِ لطف ڈالتے چلے۔ سواری لوٹی اور اسی شان اور ادب قاعدے سے پھر قلعہ میں پہونچی۔

اس پر اکثر انگریز مورخین منھ آتے ہیں کہ "بہادر شاہ اب بھی خود کو بادشاہ سمجھتے تھے"! مگر انھیں یاد کرنا چاہیئے کہ جب نپولین، جزیرہ سنٹ ہلینا میں بیٹھا خود کو ایمپرر سمجھتا اور انگریزوں کا یہ قیدی اس وقت بھی شہنشاہ پکارا جاتا تھا تو اکبر ثانی ہوں یا بہادر شاہ خود کو کیونکر بادشاہ نہ جانتے اور ہمارے سے ان کے چودہ[1] پشت کے

[1] بہادر شاہ پندرہویں مغل بادشاہ تھے

بندے کیونکر انھیں اپنا مولا و آقا نہ مانتے!

ہماری تاریخ سے نابلد اور ہماری زبان و ادب سے بے خبر جو چاہیں سو کہدیں۔ ہماری معاشرت و تہذیب کو وہ کیا سمجھیں اور ہماری ذہنیت کو وہ کیا جانیں۔ انگریز ہماری زبان جانتے ہوتے تو بے خبروں کی نہ سنتے۔ ہم سے ملتے اور پھر اس ملک میں سو ڈیڑھ سو برس کے اندر آج یوں بے آواز نہ ہو جاتے!

تخت و تاج[1] سے محبت ہماری خو ہے اور اُن کا لحاظ ہماری آبرو ہے۔ انہی بہادر شاہ میں ایک شاہی لقب کے سوا، اب اور کیا رکھا تھا؟ مگر ہم نے اُن کے گھر کا ہمیشہ ادب کیا اور اُن کے آگے بھی سر جھکانا اپنا آئین سمجھا۔ ذوق نہیں، مرزا غالب جن کی آزادیاں اور بے باکیاں مشہور ہیں، دربار میں بار پاتے ہیں تو سرِ نیاز خم کر کے کہتے ہیں کہ ؎

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے!

دیکھو، یوں ہمارا دل بولتا اور اس طرح ہمارا دماغ کام کرتا ہے۔ اُس وقت کو جانے دو۔ لکھنؤ میں برجیس قدری دَور کو یاد کرو۔ غدر میں جب

---

[1] کرؤن (CROWN) انگلستان کا وہ تاج جو ہمارا سرتاج ہے۔ اگر شروع ہی میں کمپنی (ایسٹ انڈیا) کے عوض ہند، انگریزی تاج کے زیرنگیں ہو جاتا تو پھر یہ ملک اُسے تسلیم کر کے کبھی سر نہ اٹھاتا۔

تخت پر بٹھایا گیا تو جب تک دلّی سے اسی بے پر بہادر شاہ کا پروانہ نہ گیا وہ وہاں شاہ اودھ مانا نہ گیا! یہ ستّر برس ادھر کا قصّہ ہے۔ آج بھی کوئی اسی اجاڑ لال قلعہ میں جائے تو تماشہ دیکھے کہ اس کی زیارت کرنے والے وہاں کے خالی تخت کو کس طرح چومتے اور اس کے آگے کیونکر جھکتے ہیں!!

ہمارے ایک مشہور خوش قلم نے اُردو کی پرورش اور انگریزی میں اس کی ترقی کا ذکر اپنے شاعرانہ انداز میں ایک جگہ یوں کیا ہے۔

'ادھر یہ چونچال لڑکا (اُردو) شعرا کے جلسوں میں اور اُمرا کے'
'درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا'
'ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین'
'لگائے بیٹھا تھا، اُس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے'
'مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں'
'اُس کی زبان سیکھنی واجب ہے'۔ (آب حیات)

یہ مزیدار سطریں تفسیر کی محتاج ہیں۔ جس وقت کا یہ ذکر ہے وہ شاہ عالم کا اخیر زمانہ ہے۔ اور دانائے فرنگ جب وہ دوربین اپنی جیب میں

رکھ کر ہم پر ہنستا قلعہ سے اُتر آیا وہ بہادر شاہ کا وقت ہے۔ اس لیئے ان دونوں وقتوں کے داناؤں کی دانائی کو بھی ذرا بتا دینا چاہیئے۔ انگریز اور اردو کے باب میں یہ ذکر دل کھول کر ہو گا۔ یہاں اُس کا خلاصہ سُن لو۔

جنگِ بکسر (۱۷۶۴ء) کے بعد شاہ عالم اور لارڈ کلائو کے درمیان جو عہدنامہ ہوا اس کے رُو سے اس ملک کے علم و زبان کی نگہ داشت بھی کمپنی پر فرض تھی۔ کلائو کے بعد، وارن ہیسٹنگ (۱۷۷۲ء) کا دَور دَورا ہوا۔ اُنھوں نے ایک بہانہ نکال کر شاہ عالم کا ۲۶ لاکھ سالانہ وہ نذرانہ بند کیا جس کی ادائیگی اس عہدنامہ کی اول شرط تھی۔ اس پر ملک میں ایک ہیجان ہوا۔ اس اضطراب کو دھیما کرنے کے لیئے، زبان کی نگہ داشت کے پیمان کو قائم رکھنے کا ڈھونگ نکالا گیا۔ جون گلگرسٹ نے اس سیاسی چال میں کمپنی کو بڑی مدد دی۔ اُنھوں نے کلکتہ میں مشرقی زبانوں کی پرداخت کے لیئے ایک انجمن یا سوسائیٹی قائم کر دی۔ اِدھر یہ انجمن دھیمے دھیمے اپنا کام کر رہی تھی اور اُدھر وارن ہیسٹنگ چپکے چپکے اپنا رستہ نکال رہے تھے۔ انھوں نے کلکتہ میں دو کالج قائم کیئے۔ ایک سنسکرت کا وہ ہندوؤں کے لیئے اور دوسرا عربی و فارسی کا (کلکتہ مدرسہ) وہ مسلمانوں کے لیئے۔

اکبر سے لے کر اُس وقت تک اِس ملک کی تعلیم کا رنگ ادر تھا۔ ہندو، مسلمان ساتھ ایک مکتب میں ایک ہی اُستاد سے پڑھتے۔ ہندو، فارسی خوان وعربی خوان اور مسلمان بھاشا دان وسنسکرت دان بنتے۔ ایک کے ادب (لٹریچر) کا اثر دوسرے پر پڑتا اور اِس لیئے ایک دوسرے کا غلام نہیں بلکہ بھائی بنا رہتا۔ اس نئی تجویز سے جب دو الگ الگ کالج کھڑے ہو گئے تو ہندو اور مسلمان بھی دو ہو گئے۔ ایک مکتب میں ساتھ کی تربیت بند ہوئی اور ملک میں دو طرح کی تعلیم کھل گئی۔ دونوں نے آخر اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا اور اُس پر فخر کرنا اپنا دین سمجھا۔ یہ دوئی پھر تو بڑھتی اور ذرا ذرا سی بات میں نمایاں ہوتی رہی یہ سیاست قدم قدم چلی اور ہماری ذہنیت کو آہستہ آہستہ بدلتی ہوئی آگے بڑھی!

ہماری ذہنیت کی ایسی خوبصورت تبدیلی کے بعد اب مغلوں اور توڈرمل کی دفتری زبان (فارسی) کا گلا گھونٹ دینا کیا مشکل تھا۔ مگر دانا جلد باز نہیں ہوتا۔ مچھلی زور کر کے پھنسائی نہیں جاتی۔ تجربہ کار دریا میں اپنی ڈور اور چارا چھوڑ کر بیٹھ جاتا اور سانس نہیں لیتا ہے۔ مچھلی نے چارا کھایا اور بھاگی۔ سمجھی کہ لے اڑے۔ مگر دانا شکاری اُس وقت زور نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے

مچھلی کے منھ میں ڈور کا کانٹا ہے، جائے گی کہاں؟ وہ پانی میں دوڑی ڈھوبی آخر تھکی، گری اور مزے میں پکڑی گئی! سیاسیات کا جال بھی یوں ہی بچھایا جاتا اور غریب مچھلیوں کو پہلے چارا دے کر تھکایا جاتا، پھر نکال کر اُس کا چھلکا ادھیڑا جاتا ہے!

سرکاری دفتر سے اگر فارسی دفعتہً نکال دی جاتی تو کمپنی خطا کرتی۔ اس لیئے پہلے اُردو کا بازار گرم کرنا تجویز ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا کچھ دِن اس کا بھی زور رہا۔ ملک، اپنی ملکی زبان (اردو) کو منھ پھیلائے مانگ رہا تھا۔ اس کالج نے اعتبار جمایا اور بنگالہ سے پنجاب تک اس کا شہرا ہوا۔ دانائے فرنگ نے اب فارسی کو ہنس کر دیکھا اور آخر اُسے دفتروں سے (۱۸۳۵ء) خارج کر کے اُردو کو اس کا قائم مقام بنایا گھر گھر چراغاں کیا گیا اور ملکی زبان کی یوں سرِدری پر بھولے بھالے ہندوستانیوں کی طرف سے ملک میں کمپنی کا ڈنکا پیٹا گیا!

گلگرسٹ، لوکرٹ اور ٹیلر (میران سوسائٹی) کی اُردو کے ساتھ وابستگی پر ہم اظہارِ خوشی کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے ماننے پر تیار نہیں کہ اُن کی وہ سوسائٹی جو فورٹ ولیم کالج کے سے شاندار نام سے پکاری گئی ہندوستانیوں کے لیئے

مفید اور اردو کے حق میں ایک کارنمایاں تھی اُس انجمن کا پہلا کام، عربی و
فارسی اور سنسکرت و بھاشا سے صرف اُن کتابوں کا اردو میں ترجمہ
کرنا تھا جن کی طرف اُس وقت ہندیوں کو رغبت تھی۔ ایسے ترجموں کے
کھیل تماشوں میں لگا کر اُن قدیم ایشیائی زبانوں سے ہم کو چھڑانا
اور اُن کی ضرورت کو کم کرنا تھا! پھر یہ کوشش صرف کمپنی کے اہلکاروں
کی ایک خدمت تھی کہ وہ اُن ترجموں کو پڑھ کر اس ملکی زبان (اُردو)
سے اتنے آشنا ہو جائیں کہ اپنے ہندوستانی نوکروں یا زیر دستوں
سے معمولی بات چیت کر لے سکیں اور بھوکوں نہ مریں۔ یہ سوسائٹی
واقعی اگر اردو کو بڑھانا چاہتی تو ہارون و مامون کی طرح، اس زبان
میں علوم و فنون کے ذخیرے بھی لے آتی اور اردو کو مالدار کر دیتی۔
بیس پچیس برس کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا۔ جیپان نے اسی بیس پچیس
سال میں اپنی زبان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اس انجمن کا واقعی
مقصد اگر اُردو کی ترقی ہوتا تو ملک کی کروروں آمدنی میں سے اُسے
اتنا حقیر حصہ نہ ملتا کہ وہ بھوکوں مرتی اور اپنا معمولی کام بھی نہ چلا سکتی!
انہی گلگرسٹ نے انگریزی اُردو لغت (ڈکشنری) کے ترتیب

دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ کام صرف اس لیئے ادھورا رہ گیا کہ نہ کمپنی نے مدد کی اور نہ اُن کی قوم نے! اِس سے صاف ظاہر ہے کہ کمپنی کا مطلب کچھ اور ہی تھا اور وہ ابھی کھلا جاتا ہے۔

سنو۔ ۱۸۲۸ء میں لارڈ بنٹنگ (دوسری دفعہ) یہاں گورنر جنرل ہوکر آئے۔ یہی زمانہ گلکرسٹی سوسائٹی کی جوانی کا ہے۔ اُن کے تشریف لانے کے ساتھ، بورڈ آف ڈائرکٹرز میں زبان کا مسئلہ چھڑا۔ اِس کے ایک ایماندار ممبر مسٹر ام، کریو نے اُس وقت ہماری زبان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی۔

"اُردو کی اس وقت یہاں حالت بہ جنسہ فرنچ کی سی ہے"
"کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک"
"اردو کے جان لینے سے ایک حصۂ ملک سے دوسرے"
"حصہ ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ کسی مددگار کی ضرورت"
"نہ ہوگی۔"

(دیکھو مراسلات صدر بورڈ آف ریونیو اور تجویزات مسٹر ام کریو اخیر کالم)
مسٹر کریو کی یہ اکیلی رائے بھی اپنا اثر کیئے بغیر نہ رہتی۔ بحث و مباحثہ ہو رہا

مگر ابھی کوئی تصفیہ نہ ہوا تھا کہ ممبران بورڈ میں (لارڈ) مکالے کا اضافہ ہوا۔ اُنھوں نے اس بحث میں حصہ لیا اور ولسن کے اور ان کے چند دن بیت بازی بھی رہی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے اس طالب العلم (مکالے) کی شاعرانہ تحریریں اُس وقت انگریزوں پر جادو کر رہی تھیں۔ وہ ان کی انشاپردازی میں محو ہو رہے تھے۔ بورڈ نے علم و زبان کے متعلق جو مراسلہ (ڈسپیچ) تیار کیا اُس میں ان مکالے کی قلم کاری اور شاعری بھی شریک بلکہ غالب تھی۔ مکالے نے ہمارے علوم و زبان سے سخت بے خبری پر بھی اُن کی ہنسیاں اڑائیں اور انھیں مردود کر کے یہاں انگریزی کے رائج کرنے کی سیاسی وجہیں بتائیں۔ بنٹنک نے اس مراسلہ کا ساتھ دیا اور وہ ولایت پہونچایا گیا۔

ہم اس سے ناواقف نہیں کہ ادب و زبان کی طاقت سب طاقتوں پر بھاری ہے۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ جو قوم جو لٹریچر پڑھتی ہے وہ اسی کی بولی بولتی ہے۔ ہم اسے بھی جانتے ہیں کہ اگر اُس وقت کمپنی کے اہلکار یہاں کے علم و زبان کو پڑھتے تو ہمارے ہم آواز ہو جاتے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک نظیر یہاں سن لو۔

مشہور مورّخ مسٹر کین (کلکتہ ریویو صفحہ ۶۱۸-۵۹۷ میں) لکھتے ہیں کہ۔

"جیورج ٹومس یہ دو باپ بیٹے انگلستان سے ہندوستان آئے اور یہاں رہے۔ انھوں نے ہندوستانی سیکھی اور پھر یہاں کی تہذیب و معاشرت کا اتنا رنگ اُن پر چڑھا کہ وہ اچھے خاصے ہندی ہوگئے۔ چند ہی سال میں اپنی زبان تک بھولے۔ اور جب لارڈ ولزلی نے اُن سے اُن کا حال پوچھا تو کہا کہ "ہم اپنی زبان فراموش کر گئے۔ اگر حکم ہو تو فارسی میں حال لکھ کر بھیج دیا جائے"! ایسے انگریزوں سے کمپنی خار کھاتی اور انھیں ہندی بننے سے روکا کرتی تھی۔

ہم اسے بھی خوب سمجھتے ہیں کہ جب تک یورپین علم و زبان کے دانے نہ ڈالے جاتے، ہندی دام میں نہ آتے اور یوں جلد رام نہ ہو جاتے ؎

حسن سبزے بہ خطِ سبز مرا کرد اسیر ٭ دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدیم!

مگر ہم مکالے پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ اُن کا مطلب ٹھیک اور اُن کا نقطۂ نظر درست تھا۔ ہم بھی اگر کسی غیر ملک پر حکمرانی کرتے تو اس سیاسی چال کو نہ بھولتے!

غرض، مکالے کا وہ مشہور مراسلہ ولایت میں کئی سال زیرِ غور رہا۔

یہ مکالے جب اپنے وطن واپس جاکر پارلمنٹ کے ممبر ہوئے تو وہاں اپنے اس مراسلہ کو آگے بڑھانے کا انھیں اچھا موقعہ ملا۔ یہ اپنی تحریروں کے اعتبار سے دوسرے برک[1] مانے جاتے اور ایک برق سمجھے جاتے تھے۔ اُس (برک) کی شمشیر زبان وارن ہیسٹنگ پر چلی۔ اور اِن (مکالے) کے قلم کی سنان ہماری زبان کے کلیجہ میں اُتری۔ انگریزوں اور پارلمنٹ پر ان کا اثر پڑا، اور آخر ایک پالسی قائم ہوگئی۔ فارسی تو بہ خوبصورتی کب کی ملک بدر ہوچکی تھی، اَب اردو بھی شامت میں گرفتار ہوکر دفتروں سے نکال باہر کی گئی ؎

نگہ کا وار تھا دل پر، تڑپنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر، کسی کے آن لگی!

اِن حالات و واقعات کے جاننے کے بعد ہم کمپنی کو اردو کا ہواخواہ کیونکر مان لیں۔ اور ایسی روداد کے سامنے رہتے ہوئے اُس کے اہلکاروں کو اردو کا دھرم باپ (گوڈ فادر) کس طرح کہدیں؟ یہ بڑی شوخی اور حد کی بے خبری سمجھی جائے گی!

---

[1] برک انگلستان کا مشہور مقرر ہے جس نے وارن ہیسٹنگ کے خلاف اپنی زبان کھولی اور مکالے وہاں کے مشہور خوش قلم ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں برک کی سی لسانی دکھائی۔

۱۸۵۶ء میں ارل کیننگ، گورنر جنرل ہو کر یہاں آتے ہیں میکالے کا وہ مراسلہ ان کے جزدان میں ہے۔ ملک کی نبض دیکھ کر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ دانائے فرنگ، اب فورٹ ولیم کے دیدبان سی آبحیات والی وہ ولائتی دوربین اپنی جیب میں رکھ کر ہم پر ہنستا اُتر آتا اور اپنا کام کر جاتا ہے!

اسی سن چھپّن میں کلکتہ یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی کے طرز پر کھڑی کی جاتی، انگریزی پڑھائی اور رنگروٹوں کی ایک فوج تیار کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ یہ بھرتی کے سپاہی نہ گھر کے نکلے نہ گھاٹ کے۔ وہ صرف اپنے انگریز افسروں کی میزیں صاف کرنے والے تھے اور بس اور اسّی برس کی اس جاں فشانی اور کر ور در کر ور کے خرچ اور بن خدا (گوڈلس) والی تعلیم سے ملک میں جیسے دماغ پیدا کیئے گئے وہ ظاہر ہے اور ان کی بے دماغیوں سے زمین ہند میں گلوں کی جگہ جس طرح کے خار اور کٹار اگتے اور ہمارا دامن نوچتے رہے وہ بھی عیاں ہے۔ اسی تعلیم نے اس ملک میں جانوروں سے زیادہ آدمیوں کا خون حلال کر دیا۔ اور اسی تعلیم نے ہم کو بے زبان کر کے اوروں کا فونوگراف بنا دیا!

سن چھپن تک بہادر شاہ چین سے تھے۔ اردو کو اُن کی خلوت و جلوت میں اُس وقت جو رسوخ رہا اُسے بچّہ بچہ جانتا ہے۔ شاہ نصیر و اُستاد ذوق اور مرزا غالب ہی نہیں بلکہ عام درباری اور حالی محالی تک ادب پر فریفتہ اور اُردو کے شیفتہ تھے۔ شہزادے، شہزادیاں، مرشد زادے اور مرشد زادیاں بھی قلعہ میں بیٹھی اپنی زبان کی خدمت میں اپنا وقت اور اپنی ہمّت صرف کرتیں۔ بادشاہ خود شاعر بلکہ شاعر گر تھے۔ اپنے بزرگوں کی یادگار اور ملکی اور مادری زبان کا جس طرح انھوں نے خیال کیا، شاہوں میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ بادشاہ کے کئی دیوان ہیں وہ چھپ بھی گئے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی نظیر ڈھونڈے نہ ملے گی کہ

کوئی حکمران قوم اپنی زبان کو سلام کر کے رعایا کی زبان کو یوں تسلیم کر لے۔ یہ رعایت اور یہ مروّت اسی خاندان پر ختم ہو گئی! بابر نے ترکی اور ہندی کا جوڑ ملایا، اکبر نے ہندی کو سراہا، جہانگیر نے اُسے منھ لگایا، شاہجہاں نے اُسے

لہ پروفسر آزاد نے تو عشق ذوق میں بہادر شاہ کے نام اور اُن کی شاعری تک کو مٹانا چاہا ہے مگر جنھیں حقیقی طور پر قلعہ معلّیٰ اور اس کی وجہ سے اردوئے معلّیٰ سے واسطہ رہا ہے وہ اردو کو جانتے اور زبان پہچانتے ہیں۔ ظفر اور ذوق کی زبان میں شاہ و گدا کا سا فرق ہے اور کیا کہوں!

پال نکالا، عالمگیر نے اُسے پروان چڑھایا، بہادر شاہ اول نے اُسے جوان کر دکھایا، فرخ سیر و محمد شاہ نے اس کے وقار کو بڑھایا، احمد شاہ و عالمگیر ثانی نے اسے راشٹر بھاشا (ملکی زبان) بنایا، شاہ عالم نے اسے تاج بخشا، اکبر ثانی نے اس کے اس تاج میں پر ہما بھی آویزاں کر دیا اور اخیر میں ہمارے اِن بہادر شاہ نے اپنے جذبات اس کی زبان سے نکال کر اُسے کج کلاہ بھی بنا دیا! اور یہ انھیں شاہوں کا صدقہ اور اُن کا فیض ہے کہ موجودہ حکمران قوم کی اس کے ساتھ ایسی بے رخی پر بھی وہ اس وقت ملک کی ملکہ بنی ہوئی راج کر رہی اور بنگالہ سے پنجاب اور پنجاب سے دکھن تک اپنی حکمرانی جتا رہی ہے!

یہ سن کر شاید تم کو تعجب ہوگا کہ فارسی اور اردو کے مٹانے کی ایسی تدبیروں کے بعد بھی بنگالہ تک میں وہ اپنا پرانا اثر دکھاتی رہیں نئے لوگ، نئی زبان (انگریزی) پر قربان ہوئے ہوں مگر پرانے خاندان اُس پر یہ دستور نثار رہے۔ کلکتہ کے مہاراج، راج کرشنا بہادر (مہاراجا نوا کرشنا، کے خلف اکبر) کی فارسی دانی بھی مشہور اور اُن کی اردو دانی تو اتنی بے نظیر تھی کہ انھوں نے معظم شاہ کا حال، اردو نظم میں لکھا

اور وہ حد کا مقبول ہوا۔ پھر اسی طرح ان کے فرزند رشید راجہ
کالی کرشنا بہادر بھی فارسی و اردو کے ماہر اور ان زبانوں کے اچھے
شاعر تھے۔ اُن کی لطائف اردو پڑھنے اور یاد رکھنے کے لائق ہے۔
یہ وہی راجہ ہیں جنھوں نے انگریزی کے مشہور شاعر "گِلِکی" کی ایک نظم کا
اردو نظم میں ترجمہ کر کے احسن المواعظ اس کا نام رکھا اور وہ زبان
دانوں کی مجلس میں رفعت کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہ وہی عالیشان خاندان
ہے جو کلکتہ میں سو وابزار راج فیملی کے نام سے مشہور ہوا، اور آج بھی
اس گھر کا نام بنگالہ کی زبان پر ہے۔ مشہور ٹیگور خاندان نے بھی
فارسی و اردو کی خدمت کی۔ ڈاکٹر ربندر و ناتھ، طوطی بنگالہ کے
والد، فارسی اور اردو کے ماہر سمجھے گئے۔ حافظ کے وہ حافظ تھے۔
اور کہا جاتا ہے کہ اِن ٹیگور کی شاعری میں اسی سے فارسی کا مذاق
موجود اور حافظ کے فلسفہ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ یہ کل بنگالی،
فارسی داں و اردو داں بزرگوار، اکبری (ثانی) و بہادر شاہی زمانہ کے
وہ آبدار موتی ہیں جو خلیج بنگالہ سے نکلے اور دنیا میں چمکے!
کمپنی کی وہ سیاسی چال اُس وقت مود ھو پور (بنگالہ کی

مغربی سرحد) سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بہار[1] اُس کے شکار سے جب بچا رہا تو اودھ[2] کیونکر جال میں آتا۔ اور دلّی تک تو اُس چال کا پہونچنا محال تھا۔ ۱۸۳۵ء کے بعد ہی کلکتہ کا وہ فورٹ ولیم کالج دھم سے گرا۔ نیو مضبوط نہ تھی کیا ٹھہرتا۔ ۱۸۴۰ء میں اب دہلی میں ایک اردو سوسائٹی کی بنیاد پڑی اور ڈاکٹر اسپرنگر (جرمن) کی مدد و توجہ سے وہاں اردو کا کام شروع ہوگیا۔ یہ بھی بہادر شاہ کی نیک نیتی کا پھل تھا کہ اُن کے دور میں وہاں یہ سوسائٹی قائم ہوئی۔ اور اسپرنگر کے ساتھ منشی کریم الدین[3] پانی پتی، پنڈت رام کشن، پنڈت اجودھیا پرشاد اور ہر دیو سنگھ و رام چندر جی کے سے فاضل، تصنیف و تالیف کرتے اور اپنی اردو کا خزانہ بھرتے رہے۔ یہ سوسائٹی، کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے اس لحاظ سے بہت بہتر تھی کہ یہاں علمی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں اور وہاں نرے قصے اور بے سود کہانیاں سنائی گئیں۔ دلّی کی اس سوسائٹی کی

[1] بہار ۱۸۶۰ء کے بعد شکار ہوا۔ اس جال کا حال بہار اور اردو میں پڑھنا۔ [2] اودھ اور اردو کے باب اور نصیر الدین حیدر کے حال میں تم پڑھ چکے کہ اُس وقت لکھنؤ میں اردو کا بازار کیونکر گرم تھا اور علوم و فنون کی کتابیں نثر میں کس طرح تصنیف ہو رہی تھیں۔ [3] منشی کریم الدین خلف شیخ سراج الدین پانی پتی۔ یہ کم عمری میں دلّی آئے اور وہاں تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے دہنے بازو رہے۔ متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ تذکرۂ شعرائے عرب اور تذکرۂ شعرائے ہند انہی کی یادگار میں سے ہے۔ منشی صاحب نے دلی میں شادی کر لی تھی۔ وہیں رہے اور غدر سے پہلے وہیں جان بحق ہوئے۔

طرف سے مشاعرے بھی ہوا کرتے۔ جہاں عام لوگوں کے ساتھ شہزادے بھی شریک ہوتے اور قلعۂ معلیٰ کی خاص زبان شہر میں بھی یوں عام کرتے۔



ہم نے ہندوستانیوں کی ذہنیت کا ایک اشارہ پچھلے صفحوں میں کر دیا ہے یہ ملک سن ستاون تک انگریزی شاہی کے زیر نگین نہ تھا۔ کمپنی (ایسٹ انڈیا) تاجروں کی ایک جماعت سمجھی جاتی اور وہی حاکم بنی ہوئی تھی۔ اور اس وجہ سے وہ ہندوستان کے سے ملک میں جہاں ہزاروں سال سے شاہی چلی آ رہی تھی بے وقعت تھی۔ محبّت تو بڑی چیز ہے ہندیوں کو معمولی رغبت بھی اُس کی طرف نہ تھی۔ پھر میسور کی لڑائی، کارناٹک پر چڑھائی، پنجاب پر فوج کشی اور اودھ کی بیگم سے زرکشی[1]۔ یہ باتیں کیونکر بھلائی جا سکتی تھیں۔ کلیجے پک رہے اور نالے اپنے نکلنے کا رستہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ فارسی کی ملک بدری اور پھیر

[1] اس زرکشی کا حال اودھ اور اردو کے باب میں پڑھنا۔ یہاں اتنا اشارہ بس ہے کہ جب وارن ہیسٹنگ نے نواب آصف الدولہ پر ۵۰ لاکھ کی رقم لینے کے لیے دباؤ ڈالا تو خزانہ کے خالی ہونے کی وجہ سے انھوں نے عذر کیا۔ آخرہ زرکثیر اُن کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ (فیض آباد) سے زبردستی وصول کیا گیا۔

ملکی زبان اردو کی دربدری جگمہ خون کرچکی تھی۔ کمپنی سے دل برداشتہ تھے ہی کہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ پر زیادتی شروع ہوگئی۔ کمپنی سے اور نفرت بڑھی۔ ۱۸۵۶ء خیریت سے گذرا۔ مگر سن ستاون کی گرمی نے ملک میں ایک آگ لگادی۔ مادہ تو برس ہا برس سے پک رہا تھا۔ دمدم (کلکتہ) کے کارتوس صرف ایک بہانہ[۱] تھے۔ پہلے فوج وہاں بگڑی، پھر کان پور و میرٹھ میں غدر نہیں ایک حشر برپا ہوگیا لکھنؤ ذرا بعد کو اٹھا اور دیر تک کھڑا رہا۔ پھر دلّی بگڑی اور باغی فوج وہاں جمع ہوگئی۔

[۱] اسباب غدر پر جن تاریخ دانوں نے غور کیا ہے وہ سرسید مرحوم کی اس رائے کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ ملک کی اس وقت بے چینی محض اس وجہ سے تھی کہ "ہندیوں کو ملکی انتظام میں دخل نہ تھا"! یہ فقرہ مشہور چلا آتا ہے اور سید صاحب کی بزرگیوں میں سے ایک بڑی بزرگی اس جملہ میں پوشیدہ سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ ہند پر کافی نظر کیے بغیر حیات جاوید (از مولوی حالی مرحوم) میں بھی اس فقرہ کو خاص جگہ دے کر کہا گیا ہے کہ "ملکی انتظام میں سرسید کی اس رائے نے تبدیلی کرائی اور ہندیوں کو جب سے کونسلوں میں جگہیں ملنے لگیں"!

یہاں اس سے بحث نہیں کہ کونسلوں میں ہم کو جگہیں کیونکر ملیں؟ مگر سن ستاون کا غدر ملکی انتظام میں ہمارے دخیل نہ ہونے کی وجہ سے ہوا؟ گفتگو اس میں ہے۔ اگر اس غدر کا یہی سبب تھا تو ۱۸۰۵ء کی ویلور (صوبہ مدراس) کی شورش آخر کس بنا پر تھی؟ اور پھر جبکہ لارڈ رپن کے بعد ہی یہ کونسلیں ملکیوں سے بھرنے لگیں تو گرمایا ہوا ملک کیوں ٹھنڈا نہ ہوگیا؟۔ اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ

بہادر شاہ اُس وقت اپنے گھر یعنی قلعہ میں ہیں۔ بلوائی اندر گھُستے اور بادشاہ سے مدد مانگتے ہیں۔ وہ ضعیف گوشہ نشین انکار کرتا اور اُن سے پیچھا چھڑاتا ہے۔ مگر شریر نہیں سنتے۔ جان دیئے دیتے ہیں اور بادشاہ کو جلوس کرنے پر مجبور کیئے دیتے ہیں۔ بہادر شاہ بے بس بلکہ بے کس ہیں۔ آخر ایک کرسی پر قدم رکھتے اور باغیوں کے خوف سے چند منٹ جلوس کرتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲۔ ہندیوں کے اختیارات جوں جوں بڑھتے گئے ملک کی شورش بھی تیز ہوتی چلی۔ اور آج بھی وہ نمایاں ہے۔ ہاں پہلے بے آئینی طور پر ہیجان تھا اور اب وہ ذرا باقاعدہ شکل میں ہے۔ اس لیئے سرسید کے دماغ میں غدر کا جو سبب تھا وہ صحیح نہیں مانا جاسکتا اور اُن کے مقلدوں نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ درست نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس عقیدہ کے قائم کرلینے سے ملک میں طرح طرح کی خرابیاں واقع ہوگئیں۔ عام دماغ صرف کونسلوں میں نشستیں ملتے یا نہ ملنے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور اسی کو اپنی فتح و شکست سمجھنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کے تنزل و ترقی کا اصل راز بہت کم لوگوں کو معلوم ہوسکا۔ اور اس وجہ سے ہند بیمار کو الٹی دوائیں دی گئیں اور دی جارہی ہیں یہ غلطی ستر برس سے چلی آتی ہے۔ انگریزا در اردو کے باب اور سن ستاون کے ذکر میں میں نے اس پر بحث کی ہے۔ یہاں صرف اشارہ ہوگا اور بس۔

سن ستاون کا غدر ہماری سیاسی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی انقلاب کی وجہ سے واقع ہوا۔ جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان کبھی چین سے نہ رہا۔ وہ اپنے تنزل کو محسوس کررہا تھا۔ زبان و معاشرت کا اختلاف بہت سخت ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے شروع میں اس عیب کو محسوس کرکے ہماری زبان کے سمجھنے اور ہماری تہذیب کے برتنے کی کوشش کی۔ اور جب تک کمپنی کے کارکن اس پر عمل کرتے رہے ملک کا ہیجان دبا رہا۔ مگر جس وقت اس میں تبدیلی ہوئی، بے چینی شروع ہوگئی۔ لارڈ ڈلہوزی سے پیشتر کمپنی کی پالسی بدل چکی تھی۔ اور اسی لیئے انگریزوں سے سخت مخالفت کا مادہ ملک میں پیدا ہوچکا تھا۔ انگلستان کے مدبروں نے اسی وقت اسے سمجھا تھا۔ ارل کیننگ (۱۸۵۶ء) گورنر جنرل ہوکر

انگریز ابھی شہر سے ذرا فاصلہ پر ہیں۔ بہادر شاہ کی شاہی کی خبر انھیں پریشان کر دیتی ہے اور آخر دلّی پر جان توڑ حملہ کی ٹھان لیتے ہیں۔ شہر پر کئی رخوں سے دھاوا ہوتا اور پھر کشمیری دروازہ سے برٹن بولنا ان کا لشکر بڑھتا اور چاندنی چوک تک قبضہ کر لیتا ہے۔ بادشاہ کو یہ خبر ملتی ہے تو رتھ منگوا کر اُس پر بیٹھتے اور معمولی محلات اور خاص خواصوں کو لے کر شہر سے باہر، ہمایوں چلے جاتے اور شر سے دور رہنے کی فکر کرتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳۔ ہندوستان آنے لگے تو ولایت میں ایک دعوت کے موقعہ پر انھوں نے سچ کہا تھا کہ ہندوستان کے مطلع پر آج ہتھیلی کے برابر جو ابر نظر آتا ہے وہ کل بڑھ کر ہاتھ بھر کا ہو جائے گا اور پھر وہ آسمان پر اتنا چھا جائے گا کہ ہماری تباہی کے آثار نظر آنے لگیں گے!۔ یہی ہوا اور کیننگ کے یہاں آتے ہی ہند کا آسمان غبار آلود ہو گیا اور پھر سن ستاون میں ایک غدر مچ گیا۔ کیننگ نے ہند کی فضا پر جس ابر کو بتایا تھا وہ ہمارے دلوں کے وہ بادل تھے جو یہاں کے انقلابوں اور ملکی پستیوں کو دیکھ دیکھ کر منڈلا رہے اور رکے برسنے کا رستہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ ایسی ہیجانوں کا ظہور ایک دن میں نہیں ہوا کرتا۔ مادہ بخار بنتا اور ہوا کا رخ دیکھتا رہتا اور پھر ذرا سی تحریک میں اُبھر آتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی غلطیوں میں سے ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے اس ملک کی زبان کھینچنے اور ہمارے منھ میں اپنی زبان دینے کی فکر کی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم صرف گونگے ہی نہ بنے بلکہ اپنا سب کچھ بھول لے اور انگریزوں کی بہت کم اچھی باتیں یاد کر سکے۔ اکثر مدبرین نے اسے بہت قبل سوچا تھا۔ ہندوستان میں جس طرح کی انگریزی تعلیم رواج پانے والی تھی اسکی مخالفت نہ صرف ہندیوں ہی نے اُس وقت کی بلکہ انگریز پادریوں نے بھی برملا اُسے برا بھلا کہا لیکن حکمران قوم کی پالیسی نہ بدلی۔ نہ ملکی زبان کا پاس کیا گیا اور نہ ہندیوں کے احساس و خواہشات کا۔ نئے علوم ایک غیر زبان (انگریزی) میں ہم کو سکھانے کی کوشش ہوئی۔ اور اس سے عام طور پر نہ وہ زبان ہی ہم کو آسکی اور نہ نئے علم و فن ہمارے دماغ میں جگہ پا سکے۔ ملک کی اس وقت ابتری اسی غلط رفتار کا نتیجہ ہے اور جب تک ہماری زبان میں ہماری تعلیم کا رستہ نہ کھلے ہماری ترقی بند رہے گی!

ایک طرف تو انگریزی سے ہندیوں کو نقصان پہونچا۔ اور دوسری طرف انگریز ہماری زبان سے ناآشنا ہو کر عام رعایا سے بے تعلق ہو گئے۔ براہ راست اُن سے بات چیت کر کے اُن کے خیالات معلوم نہ کر سکے۔ جو حاکم اپنی رعایا کو کسی واسطے کے بغیر سمجھ نہ سکے اسکی حکومت ہمیشہ کمزور رہے گی اور اس وقت یہی ہو رہا اور ملک اسی غلط پالسی کا شکار بنا ہوا ہے!

ادھر انگریزی فوج شہر کا محاصرہ کر کے اپنے پہرے بٹھا دیتی ہے۔ اب بادشاہ کی تلاش ہے۔ ہوڈسن، ہمایوں پہونچتا اور مغلوں کے اس آخری اور ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ اُس وقت گیروا لباس[1] کہ وہ فقیری کی نشانی ہے پہنے اور ظفر تکیہ[2] ٹیکے خموش زمین پر بیٹھے تھے۔ ہوڈسن رپٹ رپٹ کرتا آتا ہے اور بادشاہ خود کو اُس کے حوالے کر دیتے ہیں!

بادشاہ نے اُس وقت بے نظیر صبر و سکون سے کام لیا۔ اُن کا خود کو یوں حوالہ کر دینا اُن کی بے گناہی کی دلیل اور امان کی کسی سفید جھنڈی سے بھی زیادہ تھا۔ کمپنی کے بے تمیز نوکروں اور ہوڈسن کے سے گنوار کی جگہ اگر کوئی تمیز دار اور بھلا آدمی ہوتا تو بہادر شاہ کا اُس وقت لحاظ کر جاتا۔ مگر وہ بے ادب اپنی حد سے بڑھا۔ بادشاہ کو معمولی قیدیوں کی طرح شہر میں لے آیا۔ پھر اس نے شہزادوں اور مرشد زادوں کو گرفتار کیا۔ مسٹر ٹوپل سن اپنی تاریخ ہند کے صفحہ ۳۷۹ میں اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔ "اس کے دوسرے

[1] اس ملک کا قاعدہ تھا کہ مجبوری کے وقت گیروا لباس پہن کر کسی الگ جگہ بیٹھ جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ اب اس دنیا سے ہم کو کام نہیں۔ جاہ و منصب کو سلام کر کے فقیر ہو گئے۔

[2] ظفر تکیہ۔ وہ تکیہ جس کا قبضہ مڑ سکتا تھا۔ اُسے توڑ کر بغل کے نیچے رکھ لیتے اور اس کے سہارے بیٹھتے تھے۔ یہ تکیہ غالباً انہی ظفر کی ایجاد ہے۔

دن ہوڈسن نے دو شہزادوں اور ایک کمسن حسین مرشد زادے (پوتے) کو پکڑا اور آخر اُن بےکسوں اور بے گناہوں کو کھڑا کر کے اپنے پستول کا نشانہ بنا دیا"! یہی مورخ پھر کہتا ہے کہ "بادشاہ کی معمولی مجرموں کی طرح روبکاری ہوئی۔ بغاوت کا جرم اُن پر ثابت ہوا۔ قابل دار سمجھے گئے۔ مگر پھانسی دینے کے بدلے کالے پانی بھیج دیئے گئے"!

دنیا میں ایسی بے رحمی کی مثال اور بادشاہ اور شاہی خاندان کے ساتھ ایسے سلوک کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اور کمپنی کے ایسے بے ضابطہ اہلکاروں کے سوا کسی اور کی ایسی جرأت نہیں پڑ سکتی!

قدرت خدا کی! شاہ عالم کے ٹھیکہ داروں (کمپنی) کے جج کرسیوں پر بیٹھتے اور اُس کا پوتا بہادر شاہ جو دہلی کے تخت کا وارث ہے ایک معمولی مجرم کی طرح اُن کے آگے صفائی کے لیئے پیش ہوتا اور ایوان سنٹ جیمس کی جگہ وہ ایسے ججوں کے اجلاس میں کھڑا کیا جاتا ہے! شاہ ہند اپنا تحریری مدلل جواب پیش کرتا ہے۔ مگر وہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے فیصلہ جو ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا۔ بادشاہ مجرم قرار دیئے گئے! اور کالے پانی سپرد ہوئے۔ رنگون پہنچائے اور وہاں ایک جھونپڑے میں ڈالے گئے۔

لہ اس کمپنی کی اس وقت جو حیثیت ہو مگر وہ بادشاہ کو اپنے ججوں کے آگے یوں پیش کرنے کی مجاز نہ تھی۔ بہادر شاہ کا مقدمہ انگریزی شاہی دستور کے موافق لندن کے سنٹ جیمس کورٹ اور ہوس آف لارڈ میں دائر ہونا چاہیئے تھا۔

جو روزینہ[۱] مقرر ہوا کمپنی وہ بھی نہ دیتی تو قسمت کیا کر لیتی؟ تقدیر کا لکھا پورا ہوا اور شاہِ ہند، برما میں ٹکر گدا بن کر رہا۔ خیر یوں پانچ سال گذار کر ہمارا وہ چراغِ دہلی آخر خلیج بنگالہ کے طوفان میں (سنہ ۱۸۶۲ء) بجھ کر رہ گیا اور مغلوں کا نام سٹ گیا۔ بس نام اللہ کا!

جہاں پناہ! آپ ہم سے دور ہو گئے اور ہم آپ کے قدموں سے الگ ہو گئے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم کو قیدِ فرنگ میں بھی نہ بھولے اور اپنے ملک کو بھی ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ حضور کے یہ چند شعر ہم اب بھی پڑھتے اور اپنے اور آپ کے حال پر رویا کرتے ہیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں اپنے دل کو قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، مرا سینہ غم سے فگار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تلیں، بھلا خارِ غم سے وہ یوں کھلیں
ملا جبکہ طوقِ گلو انھیں، کہا بدلے گل کے یہ ہار ہے

تجھے خوفِ حشر ہے کیا ظفر، تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا، وہی تیرا حامیٔ کار ہے

بہادر شاہ! آپ کا یہ ایک اور شعر بھی آپ کے بندے اب تک دردِ الم سے پڑھتے ہیں۔
پئے مغفرت کوئی اے ظفر پڑھے فاتحہ کہاں آن کر، وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے مٹا دیا

---

[۱] کہتے ہیں کہ بادشاہ کو رنگون میں پہلے پانچ روپیہ روز خرچ کے لیے ملتا تھا۔

نہ معلوم کیا سمجھ کر آپ نے یہ کہا تھا۔ آپ کے بعد یہی ہوا۔ رنگون میں آپ کی معصوم قبر کا نشان تک مٹا اور اُس کی جگہ چوگان (پولو) کا میدان بنا! ہم اب ادھر جائیں تو آپ کے مزار کو کہاں ڈھونڈھیں اور اُس کے نشان کو وہاں کس سے پوچھیں اور آپ کے نام پر کس طرح فاتحہ پڑھیں؟!

جہاں پناہ! ہم آپ کے لیئے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور ہمارا کیا منھ جو کچھ کر سکیں ہاں ایک بات جانتے ہیں کہ آپ کو اپنی زبان سے بڑی الفت تھی۔ آپ نے اپنے بزرگوں کی اس نشانی کو ہمیشہ سینہ سے لگائے اور اپنی آخری سانس تک اُس سے دِل بہلائے رکھا۔ ہم بھی اسے نہ بھولیں گے۔ اور اپنی اردو اور آپ کی اردوئے معلّیٰ کی سلامتی کے لیئے جانیں تج دیں گے۔ اس سے آپ کی روح خوش ہوگی اس خوشی کو یاد کر کے ہماری ہمت جوان رہے گی اور ہم کو مردِ میدان بنا دے گی! جہاں پناہ! ہم اب حضور سے رخصت ہوتے اور آداب بجا لاکر اس وقت قلم کو ذرا فرصت دیتے ہیں!!

مجرا اور آخری سلام!



مجمل فہرست مضامین

داستانِ اردو

از

ادیب الملک نواب خیال مدظلہ

پہلا باب

قدیم تاریخ ہند یہاں کے اصلی دیسی باشندے اور غیر آریا۔ ان کا تمدن ان کی زبان اور ان کا مفصّل بیان۔

دوسرا باب

آریوں کی ہند میں آمد غیر آریوں پر ان کا تسلط۔ یہاں ان کا قیام، ان کی زبان، مذہب اور ادب، ویدی عہد، اور سنسکرتی دور، مہا بھارت و راماین۔ ان کا دلچسپ خلاصہ اور معدل، والمیکی و کالی داس، ان کے لاجواب ناٹک (ڈراما) اس عہد کی دوسری نظمیں پنچ تنتر (انوار سہیلی) اور سکنتلا۔ آریا برت (قانون) اور ملک میں اس کا چلن۔

تیسرا باب

بودھ مت گوتم جی کا ظہور، ان کے دلچسپ حالات۔ اور ان کے مت کا عروج۔ گوتم جی کی دیسی زبانوں میں سکھیا (وعظ) برہمنوں اور سنسکرت کا دبنا اور عوام اور ملکی پراکرتوں کا ابھرنا۔ بودھ کی وفات، چندر گپت اور راجہ اسوکھ کا بودھ مت کو قبول کرنا اور اسے بڑھانا اور اس نئے دین کا ایشیا پر چھا جانا۔

جین مت مہاویر (دستر ہتی بہاری) بانی جین مت کا ظہور۔ ویبلی اور مگدھ دیسی زبانیں۔ مہاویر کا ان پراکرتوں میں وعظ۔ اور اس وجہ سے ان زبانوں کا عروج قدیم انگا (موجودہ بھاگلپور بہار) کے ٹھاکروں اور مگدھ دیسی راجاؤں کا جین مت کو سراہنا اور اسے پھیلانا۔ پورب کے علاوہ متھرا اور اجین تک اس نئے مت کا بڑھنا اور پھولنا پھلنا۔ ادھر کے راجاؤں کا اس مت کو قبول کرنا اور ان کی بھاکھا میں اس کے

ڈنکے کا بجنا۔

سامی نسلوں اور سامی زبانوں کا ذکر۔ سریانی اور عبرانی کا عروج اور زوال۔ بنی اسرائیل (یہود) مصر میں۔ سندھ کے شدروں سے بدتر ان یہود کی حالت۔ حضرت موسیٰؑ کی ان پر شفقت۔ علمائے بنی اسرائیل کا اس ملک کے پنڈتوں سے زیادہ سخت و درشت ہونا۔ اور اس وجہ سے یہودیوں کا بے بصرہ کر کرنا۔ حضرتِ عیسیٰؑ کا یہود کی خراب حالت سے متاثر ہو کر ربیوں (علمائے یہود) کے خلاف آواز بلند کرنا۔ سریانی اور عبرانی کے عوض اپنی ملکی اور دیسی زبان۔ حضرتِ عیسیٰ کی تعلیم و تلقین اور اس کی تدوین۔ سندھ اور مصر و عرب و شام کی تاریخوں، مذہبوں اور زبانوں کا ایک سا فسانہ۔ مذاہب کا زبانوں سے اور زبانوں کا مذاہب سے ترقی پانا۔ اور ایک کا دوسرے کے دامن سے لپٹا رہنا۔ حضرتِ موسیٰؑ و حضرتِ عیسیٰؑ اور گتوتم جی اور مہاویر کا ایک ہی مقصد کیلئے اٹھنا اور انکی تلقین سے عوام اور ملکی و دیسی زبانوں کا ابھرنا اور ربیوں اور پنڈتوں کا گرنا!

آٹھویں صدی عیسوی میں کمار یلا بھاری پنڈت کا برہمنی دھرم میں نئی روح پھونکنا اور سنسکرت کی پھر سرورری قائم کرنے کی کوشش کرنا مگر یہاں کی پراکرتوں اور بھاشاؤں کے زور اور طوفان میں سنسکرت کے درخت کا پھر قائم نہ ہونا اس کا گرنا اور سوکھنا اور یہاں کی بھاشاؤں کا جڑ پکڑنا۔

چوتھا باب

ہند کی پراکرتیں

صوبہ صوبہ بلکہ ضلع ضلع کی زبانوں کا مختلف ہونا۔ ان میں سرسینی یعنی برج بھاشا کا آگے بڑھنا۔ برج یعنی متھرا کے وسط ہند میں ہونے اور ایک بڑی تیرتھ گاہ ملنے جانے کی وجہ سے سارے ملک سے اس خطّہ کا واسطہ اور وہاں کی زبان (برج بھاشا) کا دوسری ملکی زبانوں سے رابطہ۔ اس بھاشا پر سنسکرت کا اثر۔ اس کا سنسکرتی بھاشا کا لقب پانا اور بعد کو راشٹر بھاشا (لنگوا فرینکا) بننا اور ملک پر اس کا چھا جانا۔

پانچواں باب

ایران و زردشت

اس معلم دیبا مبر کا مذہب، اس کی زبان، اس کی کتاب (اوستا) کا ژند میں لکھا جانا۔ سنسکرت و ژند کا اصلاً ایک ہونا۔ سندھ و ایران کے قدیمی برادرانہ تعلقات اور ان کی زبانوں کے ایک دوسرے پر اثرات

چھٹا باب

یونانیوں کا عروج

ان کی تہذیب معاشرت، یونانی علوم، فلسفہ و شاعری۔ سکندر۔ سقراط افلاطون و ارسطو کی تعلیم۔ سکندر کا ایران پر حملہ

دارا کی شکست و فرار۔ ایرانی علوم و فنون کی پامالی۔ اور مذہب زردشت کی ژولیدہ حالی۔

ساتواں باب

موجودہ افغانستان کے شمال سنجباری ملک کا وجود۔ سکندر کا اس خطے میں ورود۔ سکندر کی پر چڑھائی۔ یونانی زبان و علوم کی شاہی۔ ہماری پراکرتوں پر ان کا اثر۔ اور سندی لفظوں میں یونانی الفاظ و خیالات کا گذر۔

آٹھواں باب

سند کے ساتھ دنیا کے تعلقات۔ مصر و بابل اور فلسطین و شام اور دربار حضرت سلیمان تک سندیوں کی رسائی، اور سندی و سریانی و عبرانی کی ہمنوائی۔ جنوبی شام میں سندیوں کی نوآبادی۔ حضرت عیسیٰؑ کا دراویدی (دکھنی) ہونا، اور انجیل میں تاملی (زبان) لفظوں کا پایا جانا۔

نواں باب

سندیوں اور قدیم فارسیوں اور خصوصاً ساسانیوں کے تعلقات۔ داراب و بہرام گور کا بھیس بدل کر سند آنا۔ ہزاروں سندی گویوں کا ایران جانا۔ اور لولیان سند وہاں ان کا لقب پانا۔ شاہان فارس کا لڑائیوں کے وقت سندی راجاؤں سے مدد مانگنا۔ اور خوصلہ اور محبت کے ساتھ ان راجاؤں کا ان کی مدد کرنا یہاں سے شنکر پہلوان کا توران جانا اور رستم سی

اس کا مقابلہ کرنا۔ سندی سپاہیوں کا ایران میں قیام۔ سندی شہزادوں کا فارس و آرمینیا میں بسنا۔ سندیوں (جاٹوں) کا ایرانیوں کی طرفداری میں عربوں سے لڑنا۔ اور پھر عربوں سے ان کا ملنا۔ اور یوں عربی سندی کا مصافحہ کرنا۔

دسواں باب

ملک عرب، وہاں کی خصوصیات، عرب قبل اسلام۔ عرب و فارس۔ جنگ نہاوند و قادسیہ ساسانیوں کی شکست۔ عربوں کی فراخ دلیاں فارسیوں سے رشتہ مندیاں شہربانو کا اہلبیت میں خیر مقدم۔ اور فارسی کا تازی سے رشتہ محکم۔

گیارواں باب

عربی مسلمانوں کا سندیوں سے برادرانہ برتاؤ جاٹوں کی قریب بصرہ نوآبادی۔ جنگ جمل میں ان کا حصہ۔ جناب امیرؑ کا انھیں (بوقت جنگ) محافظ خزانہ بنانا۔ خلفائے دمشق کا ان جاٹوں سے مدد لینا۔ اور رومیوں کے مقابلہ میں انھیں تیار کرنا۔ عبدالملک کا انھیں انطالیہ میں بسانا۔ خلیفہ کا ان پر اعتماد۔ اور ان تعلقات سے عربی سندی اتحاد۔

بارواں باب

عربی جمہوریت، خلافت اور بادشاہت ایران میں عربی حکومت۔ آریا زبان یعنی دری و پہلوی کی دربدری۔ اور تازی (عربی) کی

سروری۔ خراسان و مرو اور سجستان ری ملک پر
عربوں کا قبضہ اور ترکی (زبان) میں تاری الفاظ
کا داخلہ۔ عربوں کا شمال کی طرف سے سندھ میں آنا۔
اور یہاں عربی کا مہمان ہونا۔

تیرواں باب

مسلمان سندھ میں۔ محمد قاسم کا ہندیوں کے
ساتھ برادرانہ برتاؤ۔ ہماری راج کماریوں اور
عام عورتوں کا عراق اور شام جانا اور وہاں ان کا
بار پانا۔

محمد علافی عربی جنرل کا مغربی شمال ہند میں گھر کرنا
اور ہمارے راجاؤں سے اس کا پگڑی بدلنا اور یوں
عربی و ہندی کا گلے ملنا۔

چودھواں باب

خلفائے دمشق کے درباروں میں ہندی اہل
فن کی قدر و منزلت۔ مامون (خلیفہ) کی ان پر شفقت
خراسان و مرو سے اس کی محبت اور فارسی پر اس کی
رغبت۔ ایران میں ملکی و قومی زبان (فارسی) کی زندگی
اور اس کی تابندگی۔ امام علی رضاؑ (بزمانہ مامون)
کا طوس میں قیام۔ بنی فاطمہ کا سیستان پر اثر۔ اور عربی و
فارسی کا ہند تک گذر۔

پندرواں باب

قدیم ترک و تاتار۔ ترک بہ حیثیت مسلمان۔ ان کا
عروج اور چنگیزیوں کا خروج۔ آل سامان، غزنوی
سلطنت الپتگین و سبکتگین کی سرگذشت سلطان
محمود کی باغ ہند میں گلگشت۔ راجہ جیپال کی غزنی میں
مہمانی۔ ہند و خراسان کی راہ کا کھلنا۔ محمود کے لشکر میں
ہندی سپاہیوں کا بھرتی ہونا۔ راجہ کنور رائے اور
محمود۔ راجہ کا بہ حضور سلطان۔ بھاشا میں ایک قصیدہ
نظم پیش کر کے مفتوحہ قلعہ گوالیار کا واپس لینا۔ بھاشا
کی فتح۔ یہاں کی زبان سے محمود کا اور فارسی سے ہندی
راجاؤں کا بلد ہونا۔ غزنی کا دارالترجمہ اور ہندی و
فارسی محکمہ۔ سلطان مسعود (فرزند محمود) کی بے تعصبی۔
یہاں کے راجاؤں سے اس کی دوستی۔ ہندیوں کے
ساتھ سلطان کے سلوک۔ سردار تلک کو اپنی فوج کا
سپہ سالار بنا کر سندھ بھیجنا اور قومی تعصبات کا مٹانا۔ فارسی
بھاشا کا ربط اور ترکی و تاتاری الفاظ کا خلط ملط۔ قصہ فردوسی
و شاہنامہ۔ اس مثنوی کا ترک و فارس پر غیر معمولی اثر۔
محمود اور مسعود کی محبت اور ہند و فارس کے تعلقات
کی وجہ سے شاہنامہ کی اس ملک میں اشاعت، اور
ہندیوں کے خیالات میں انقلاب و وسعت!۔

سولواں باب

ترک ہند میں۔ غوری، شہاب الدین غوری اور راجہ
کی راج کماری ترکی و ہندی اختلاط۔ سلطان بلبن، علم و
ادب سے اس کا ذوق اور بھاشا سے شوق۔ میر خسرو کے
طوطی زبان کا چہکنا۔ خالق باری کی پیدائش۔ ہندی اور
فارسی نگینوں کا ساتھ ساتھ جڑنا۔ اور نئی (ترکی) اور
پرانی (ہندی) قوموں کا گلے ملنا۔ سلطان جی (نظام الدین
اولیا) اور شاہ بو علی قلندر کی ملکی زبان میں خط و کتابت۔

اوران ولیوں کی کرامت ۔ خلجیوں کی مجلس ۔ ہند فضلا کی باریابی اور کتھا کس (پنڈت) کی کامیابی ۔ علاؤالدین اور کملا دیوی ۔ قلعۂ سلطانی کا راج گدھ بننا ۔ اور فارسی ہندی جھنڈے کا ساتھ اُڑنا اور لہرانا ۔ خضر خاں و دیول دیوی ، فارسی ہندی عشق ۔ ایک نادر فسانہ اور زبانوں پر اس کا ترانہ ۔ فارسی ہندی گورنمنٹ ۔ قطب الدین مبارک شاہ کا مبارک زمانہ ۔ اصلی رکھی بندن ۔ خسرو ، ایک ہندو نژاد کا تخت سلطانی پر بیٹھنا اور ہندی فارسی بخت کا ساتھ چمکنا ۔

تغلقوں کی محفل ۔ محمد تغلق کی بے تکلف مجلس ۔ ہندی کوی (شعرا) دربار میں سلطان کا بھاشا سے شغف ، قصبہ کھور (ضلع فرخ آباد) میں اس کا گذر ۔ خوش ہو کر اس مقام کو (فارسی خطاب کے عوض) سرگ دواری (دروازۂ جنت) لقب بخشنا ۔ اور یوں بھاشا کو سرفراز کرنا ۔ سلطان فیروز کی فیروز بختی ۔ ہندی (زبان) سے اس کی دوستی نگر کوٹ سے سنسکرت اور بھاشا کے ذخیرے کا منگوانا اور فارسی میں ان کا ترجمہ کروانا ۔ ہندیوں کو فارسی اور ترکوں کو ہندی سکھانا ۔ پنڈتوں کو عالم بنوانا اور فارسی ہندی پرچم کا ساتھ چمکنا ۔

لودھیوں کا دُربار ۔ دربار سکندری کی انجمن سلطان کا ادبی ذوق ۔ فارسی کے ساتھ بھاشا کا شوق ۔ ارگر مہا بیدک کی ہندی طبی تصنیف کا فارسی میں ترجمہ کرانا اور طب سکندری اس کا لقب پانا ۔ سلطان کا فرمان فوج میں تعلیم کا پھیلانا اور ناخواندہ کو خواندہ بنانا ۔ نظام ملکی میں کالے گورے کی قید کا اٹھانا اور ہندیوں کو اپنے برابر بٹھانا ۔ ترکوں کی ہندی اور ہندیوں کی فارسی ۔ پنڈت ڈونگرمل کا قند پارسی ۔ ان دو زبانوں (بھاشا و فارسی) کا شیر و شکر ہونا ۔ اور اُردو کے سے شربت کا بننا اور بٹنا ۔

سترواں باب

ہند میں مختلف مذہبوں اور متوں کا خروج ۔ لودھیوں کے وقت میں ان کا عروج ۔ گرونانک کا ظہور ۔ اُن کے وظائف و درود ۔ اور ان میں فارسی لفظوں کی نمود ۔ بابا کبیر داس اور کبیر پنتھی مت ۔ ان کی ہندی فارسی گت ۔ بابا تلسی داس کے نادرات (دوہے) اور ان میں فارسی الفاظ و خیالات کی بہتات ۔

اٹھارواں باب

اُردو

فارسی کی کمزوری اور ہماری پراکرتوں کی شہزوری ۔ پنجاب میں ایک نئی زبان کی بنیاد اور اس کی روداد ۔ بھاشا کے سر پر تاج اُوپد ہمارا راج ۔ اس بھاشا کا کینچلی بدلنا ۔ نکھرنا اور ملک میں اس کی ہوا کا چلنا ۔ اس راشٹر بھاشا کا فارسی بھاشا لقب پانا ۔ قالب بدلنا اور آخر اردو کا موزوں خطاب اختیار کرنا ۔ ملکی پہیلیاں ، کہ مکریاں ، انمیلیاں ، دو سخنے اور لوریاں ۔ ان میں مختلف رتن ۔ اور ہمارے بزرگوں میں اُن کا چلن !

انیسواں باب

مغلی دور

مغل اور اُردو ۔ امیر تیمور کے

کارنامے اور سند میں اس کے نسالئے ۔ بابر اور ہند ۔ اس ملک
اور یہاں کی بھاشا سے اُس کی الفت اور فارسی کے ادب
عام نہ ہونے پر اُس کی حیرت ۔ بادشاہ کا ترکی خرقہ اور ہندی
جامہ ۔ شاہی گفتار اور اردو میں اپنے جذبات کا اظہار ۔

ہمایونی دور ۔ بادشاہ کا ادبی ذوق ۔ کامران کو اُس
کے ایک شعر کے صلہ میں ایک قلعہ کا بخشنا اور ادب کی
داد دینا ۔ مہابلی جی (اکبر) اور اردو ۔ نورتن سنسکرت کے
علم وفن کی قدردانی اور انھیں فارسی خلعت بخشنے کی
دلچسپ کہانی ۔ بیربل اور ٹوڈرمل کی ادبی جانفشانی
مؤتمن الدولہ (راجہ ٹوڈرمل) کا فرمان ۔ اور دفاتر میں
فارسی زبان ۔ فضائل ابوالفضل اور فیض فیضی ۔ عقد اتحاد
اور ہندو مسلم اعتماد ! ایک شادی کا منڈھا چھوانا ۔
اور ہندی اردو گانا ۔ سلیم (جہانگیر) اور اردو ۔ رجپوتوں
سے سمدھیانہ ۔ جودھا بائی کا کاشانہ محل کی رجپوتی بھاکھا
اور ترکی و فارسی سے اُس کا بہناپا ۔ نورجہاں اور اُردو
اُس کی بزم اور ایک اردو نظم ۔

خرم (شاہجہاں) اور اردوئے معلّٰی ۔ ایک زچہ خانہ
اور دلالی جی کا ہندی گانا ۔ قلعہ کی زبان اور بادشاہ کا ایک
اردو فرمان ۔ طفل اردو کی پرورش ۔ اور شاہجہاں کی
اس پر نوازش ۔ قلعہ معلّٰی کی طرح اردو کا اردوئے معلّٰی
خطاب پڑنا اور اس زبان کا بڑھنا ۔

دارا شکوہ اور اردوئے معلّٰی ۔ شہزادہ کی سنسکرت دانی
اور فارسی میں اس کی ترجمانی ۔ اردو اور بھاشا سے اُس کی
الفت اور چندربھان (مشہور شاعر و ادیب) پر اس کی
عنایت و شفقت ۔

عالمگیر اور اردوئے معلّٰی ۔ اردو اور عالمگیر کا ایک
گھر میں پیدا ہونا اور ہوش سنبھالنا ۔ کب کے سے نامی
کوی (شاعر) کا دربار میں جگہ پانا ۔ اور اس کا زبانِ شہ
بن کر اور راجہ جسونت سنگھ سے مل کر حق سفارت
ادا کرنا ۔ رقعات عالمگیری اور شاہی ہمہ گیری ! ایک
موقعہ پر عربی فارسی شعر کے عوض بادشاہ کا ایک
ہندی کہاوت سنانا اور اپنی مادری و ملکی زبان کا
سراہنا اور اس کا درجہ بڑھانا ۔

زیب النسا اور اردوئے معلّٰی ۔ شہزادی کا علم و ادب
محلات کی زبان اور اردو پر زیب النسا کا احسان ۔
اس کی رفتار و گفتار اور اس کے اُردو اشعار

بیسواں باب

اردو اپنے گھر (دہلی) میں ۔ دکھنی شہزادوں اور
امیروں کا دلی میں بسنا اور اردو کا رچنا ۔ اردوئے
معلّٰی اور دکھنی (اردو) کا ملنا اور اُن کا منہ بولی بہنیں
بننا ۔ اس زبان میں نظم و نثر کا آغاز اور اردوئے معلّٰی
کا امتیاز ۔

اکیسواں باب

بہادر شاہ اول اور اردوئے معلّٰی ۔ نعمت خان عالی
کے سے بلبل ہزار داستان کا چہکنا اور میر جعفر زٹلی
کے سے زبان آور کے طوطی کا بولنا ۔ عالم برہمن کی
عالم کیلی (ہندی تصنیف) اور رسک پریا کی
تالیف اور ان تصنیفوں پر بادشاہ کی تعریف ۔

فرخ سیر اور اردوئے معلّٰی - سادات (وزرا) کی زبان اور صاحب ظہیر الانشا کا بیان - بادشاہ کی شادی اور اردو کی خانہ آبادی - مرزا عبد القادر بیدل کا ادھر دل دینا اور اُردو غزل کہنا -

طفلِ اردو کا مکتب - نواب عمدۃ الملک کی اُردو انجمن - اُن کی زبان و شاعری - اس زبان کے ایسے زبردست امیر کا انجام اور میکدۂ دہلی میں اُردو کا اخیر جام!

محمد شاہ بادشاہ اور اردوئے معلّٰی - فرخ سیری محمد شاہی امراء - نواب نوازش علی خاں کا خاندان اور اُردو کی پہلی نثر کا بیان - بادشاہ کی سندی دانی اور ملکی زبان کی قدردانی -

احمد شاہ بادشاہ اور اردوئے معلّٰی نادرگردی مرہٹہ گردی - اور درانیوں کی بے دردی - اُردو کا دیس نکالا - اور اودھ میں اس کے چراغ کا اُجالا نواب فغاں (کوکہ احمد شاہ) کی زبان - اردو پر ان کا احسان - عظیم آباد (پٹنہ) میں ان کا قیام اور وہاں اس زبان کا استحکام -

عالمگیر ثانی اور اردوئے معلّٰی - بادشاہ کی بزم اور اُن کی ایک اردو نظم -

شاہ عالم اور اردوئے معلّٰی - بادشاہ کا آفتاب (تخلص) بن کر چمکنا - اور آسمان شہرت تک اُن کی نظموں کا پہونچنا - بکسر کی لڑائی اور خاندانِ مغلیہ کی پسپائی - دلی کا اُجڑنا اور اُردو کا دربدر پھرنا -

ظفر شاہ اور اردوئے معلّٰی - قلعہ کا آخری سماں وہاں کی اُٹھتی بزم میں شمعِ اُردو کا دھواں -

بائیسواں باب

اودھ اور اُردو - سالار جنگی و صفدر جنگی امرائے دہلی کا اودھ میں بسنا - بہو بیگم اور دُلہن بیگم کے ساتھ، دلّی کی ایک تیسری بیٹی (اردو) کا اودھ جانا اور وہاں قلعۂ معلّٰی کی زبان کا پھیلنا -

نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ (والیان اودھ) کی زبان - دہلی کے چیدہ فہموں اور ادیبوں کا فیض آباد میں جمنا اور اُن کی ریاضتوں سے اردو کے باغ کا وہاں لگنا -

میر ضاحک - میر حسن اور میر خلیق کی زبان، مرثیوں کا بیان اور مذہبی و اخلاقی شاعری کی طرف طبیعتوں کا میلان - لکھنؤ اور اُردو - نواب سعادت علی خاں کا علمی دربار - علامہ تفضل حسین کی رفتار و گفتار اور سید انشا کی زبانِ گوہر بار - لکھنؤ میں طفل اردو کی جوانی اور وہاں کے ادیبوں کی اُس کی خدمت میں جانفشانی دلّی کی قید سے اُردو کی آزادی اور لکھنؤ میں اُس کی آبادی -

غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر (شاہان اودھ) کی اُردو سے محبت - اور محمد علی شاہ و امجد علی شاہ کی اس زبان سے اُلفت - خواجہ آتش کی گرم بازاری اور اُن کی ٹکسالی زبان کی لکھنؤ میں قدر اور وہاں اُس کی آبیاری -

میر انیس کی خاص زبان و شاعری۔ اُن کے خاندان کی سو سال کی اُردو کی خدمت۔ اور تاریخی ادبی دنیا میں ایسی مثال کی ندرت و اہمیت۔

واجد علی شاہ اختر کی اُردو دانی اور اس زبان کی قدردانی۔ شاہ اختر کی گردش، مٹیا برج (کلکتہ) میں اس ستارے کا قیام اور وہاں کے شاہی سبع سیارہ (درباری فضلا و ادبا) کا ترقی اُردو میں اہتمام۔ سن ستاون کا غدر اور لکھنؤ میں ایک حشر۔ اُردو گردی گر ہمارے اردو کی پامردی۔ اس زبان کی خدمت پر ان کالموں کو کسنا اور اس کے پیچھے جانوں کو تجنا!

تیئیسواں باب

صوبۂ بہار اور اُردو۔ اُس صوبہ کی قدیم سیر کرت بعد کو برج بھاشا سے اس کی موانست۔ بہاری کوی (شاعر) کی زبان و شاعری۔ قرآن السعدین (از خسرو) کے جواب میں اُس کی ایک ہندی مثنوی۔ اُس وقت کی زبان اور قلعۂ رہتاس کی فتح پر ایک سپاہی کا (نظم میں) تاریخی بیان۔

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری (شرف تخلص) کا (سنہ ۷۲۵ھ) بہار تشریف لے جانا۔ اور اُس وقت کی بھاشا میں اُن کا ہم کلام ہونا۔ اس زبان میں آپ کے دوہے (دوہرے) "کہہ مندرہ" آپ کی ایک ہندی اُردو تالیف اور بیماریوں میں نئے علاج اور جھاڑ پھونک کی تجویز!

عظیم آباد (پٹنہ) اور اُردو۔ شہزادہ عظیم الشان اور علامہ فطرت دہلوی کی زبان۔ دہلوی اردو کا وہاں رواج اور بعد کو اس کا عظیم آباد میں رواج۔ بیدل اور اُن کی زبان اور اردو نظم کی طرف اُن کا میلان۔

فرخ سیر اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں کی اس صوبہ اور عظیم آباد پر عنایت۔ امرائے دہلی و پانی پت کی آمد اور اردو کی وہاں خدمت

نواب مہابت جنگ اور نواب ہیبت جنگ (نواب شہید) کی صوبہ داری۔ اور اردوئے معلّٰی کی وہاں آبیاری نواب اسد جنگ۔ نواب جعفر علی خاں (پانی پتی) نواب میر رستم علی خاں (میر رستم علی) نواب میر بادشاہ علی خاں۔ نواب غلام حسین خاں (صاحب سیر المتاخرین) اور نواب ابراہیم علی خاں (صاحب گلزار ابراہیمی) کے سے دہلویوں کا عظیم آباد میں قیام اور ان کی توجہ سے وہاں اردو کا استحکام۔

راجہ رام نرائن اور مہاراجہ شتاب رائے (صوبہ داران بہار) کی اردو دانی اور نواب اشرف علی خاں (کوکہ احمد شاہ بادشاہ) کی زبان دانی۔ عظیم آباد کا چھوٹی دلی بننا اور اردوئے معلّٰی کا وہاں سنورنا۔

مرزا مینڈھو اور مرزا جنگلی (شہزادگان نواب شجاع الدولہ اودھ) کا اس شہر میں بسنا۔ اور مرزا جھاؤلال لکھنوی میر کا وہاں گھر کرنا۔ اور لکھنوی اردو کا عظیم آباد میں جمنا۔

ملا تحقیق کی اردو۔ راسخ کی زبان و شاعری، اور میر تقی میر سے اُن کی ہمسری و برابری۔ میر اشک و فریاد اور خواجہ میر درد کے ادبی مدرسہ کی عظیم آباد میں یاد۔

مصنف کا خاندان، اس کا دہلی نژاد ہونا۔ اور اس خانوادے کا دو سو سال اردو کی خدمت کرنا۔ نواب جلال الدین خان اثر کی زبان و شاعری۔ ۱۸۴۰ء سے قبل (بہ حیثیت صدر اعلیٰ) اردو میں اُن کا فیصلہ مقدمات لکھنا اور بہار کا اس زبان کی نثر میں بھی اور صدر بول سے آگے رہنا۔ میر انیس کا ادھر تشریف لانا۔ اور اس وقت کے عظیم آبادیوں کی زبان۔ اور ان کے لب و لہجہ پر اس فدائے اُردو کا خوش ہونا اور انھیں سراہنا۔

چوبیسواں باب

بنگالہ اور اردو۔ مرشد آباد۔ ڈھاکہ۔ اور کلکتہ اور اردو۔ ممالک متحدہ اور اردو۔ رام پور بھوپال اور اُردو مدراس و بمبئی اور اُردو۔ برما اور اردو۔ پنجاب اور اردو۔ پانی پت اور اردو۔ کشمیر اور اردو۔ صوبہ سرحد اور اُردو۔ سندھ، راجستان، بلوچستان و سیستان اور اردو۔ بوشہر، بندر عباس، بصرہ، عراق، عدن اور بندر سعید (مصر) اور اُردو۔

پچیسواں باب

اُردو کا دوسرا دور۔ ملک دکھن۔ مہاراشٹری یا مرہٹی۔ دکھنی، بہمنیوں، نظام شاہیوں، عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کا ادبی ذوق اور خواص عوام میں دکھنی اردو کا شوق۔

سلطان عادل شاہ کی ملکہ بوبوجی اور سلطان محمد علی کی بیگم، بھاگ متی، ان مرہٹی رانیوں کا محل میں اقتدار۔ اور دکھنی پر اُن کا اختیار۔ گنگو جی مرہٹی برہمن کا مشیر سلطنت بننا۔ فارسی کا دفتر سے نکلنا۔ اور دکھنی کا داخل ہونا۔ دکھنی کے ادیب۔ شجاع الدین نوری اور ہاشم علی کے دکھنی اُردو میں مرثیے اور دوسرے نامی شاعروں کی مثنویاں اور قصیدے دکھنی اردو پر شمالی اُردو کی چڑھائی۔ ان کا گلے ملنا۔ اور دکھنی کا شمشیر دو زبان بننا۔ بحری کی مثنوی من لگن۔ اس صوفیانہ نظم کا عالمگیر کے نام معنون ہونا اور بادشاہ کا اس کی قدر کرنا۔

قطب شاہیوں کا زوال۔ تانا شاہی مزاج۔ بھاگ نگر (موجودہ حیدرآباد) اور گولکنڈہ کی اجڑتی بزم اور سلطان (ابو الحسن) کی ایک درد بھری نظم۔

محمد شاہ بادشاہ اور نواب آصف جاہ۔ دکھن کا ایک مستقل صوبہ بننا۔ اور آصف جاہ اور دلی کے امیروں کی بدولت دکھن میں اردوئے معلیٰ کا رواج۔ اور آخر اس زمین پر بھی اس کا راج

آصف جاہیوں کی علوم و زبان اور خصوصاً اُردو سے محبت۔ محبوب دکھن (اعلیحضرت میر محبوب علی خاں جنت آرامگاہ) کی اُردو پر شفقت موجودہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کا اس زبان کو شرف بخشنا۔ اور مثل شاہ جہاں اس کی پرورش کرنا۔

سالار جنگ اول کا اردو کو فروغ دینا۔ سالار جنگ دوم کی اس زبان پر عنایت۔ اس کی اشاعت ان کے عہد وزارت میں اردو کا سرکاری زبان بننا اور دفتروں میں اس کے پھریرے کا اڑنا۔

مہاراجہ چندو لال کی اردو پرستی۔ ہز اکسلنسی
مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد شاد کی علم دوستی
اردو پر مہاراجہ کی خاص عنایت۔ اور اس قومی و
ملکی زبان سے ممدوح کی دلی الفت۔

چھبیسواں باب

اتحاد کے اثرات۔ ہندی رتن (الفاظ) کے ساتھ
فارسی جواہرات۔ اور فارسی بولیوں میں ہندی بات
ہندو مسلم اعتماد۔ ایک نادر اتحاد (اردو کے)
شعرا اور بنگالی ادبا۔ ہماری عورتوں کا اپنے مردوں کے
شریک حال رہنا۔ اور آخر میں انگریزوں کا ہمارا
ساتھ دینا اور ملکی زبان کی خدمت کرنا۔

ستائیسواں باب

انگریز اور اردو۔ یورپ کے ساتھ ہند کے قدیم
تعلقات۔ پرتگالیوں کی شورش اور ولندیزوں اور
فرانسیسیوں کی یورش۔ ان کے الفاظ کا اردو میں چھٹنا
اور زبانوں پر ان کا چڑھنا۔ انگریزوں کی سیاحت
ان کی تجارت۔ انگریزی کوٹھیاں اور اردو انگریزی
بولیاں۔ جنگ پلاسی۔ سوراج کی آواز کا دبنا۔ اور
انگریزی ڈنکے کا بجنا۔

اٹھائیسواں باب

انگریزی اقتدار۔ حکومت کی نئی رفتار۔ فورٹ ولیم
کالج (سنہ ۱۸۰۰ء) کلکتہ کا قیام اور وہاں اردو کا نام
کام۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز (ایسٹ انڈیا کمپنی)
میں یہاں کی زبانوں پر بحث۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں سرکاری
دفاتر سے فارسی کا نکلنا اور اردو کا بڑھنا۔ لارڈ
مکالے (ممبر بورڈ) کا مشہور مراسلہ (ڈسپیچ) مشرقی
علوم و زبان پر صاحب کی ایراد اور انگریزی
کی ایجاد۔

انتیسواں باب

ممالک متحدہ و پنجاب میں اردو کو فروغ اور
اسے کارآمد بنانے کا شوق و ذوق۔ اردو سوسائٹی
(دہلی) کی بنیاد سنہ ۱۸۴۳ء میں ڈاکٹر اسپرنگر کی
اردو خدمات۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مل کر
اس زبان کو بڑھانا۔ اور اس کی آواز کا اٹھانا

تیسواں باب

سنہ ۱۸۶۰ء میں سائنٹیفک سوسائٹی اور ایک
اردو اکیڈمی کا علی گڑھ میں قائم ہونا۔ راجہ جے کشن
داس اور سرسید کی اس معاملہ میں جد و جہد
اور مسٹر ولیم (کمشنر میرٹھ) اور مسٹر بریلی (کلکٹر
ضلع) کی ترقی اردو میں کد۔ ڈیوک آف آرگائل
(وزیر ہند) کا اس اکیڈمی کا سرپرست ہونا۔
اور ولایت میں بھی اردو کی آواز کا اٹھنا۔

سنہ ۱۸۶۸ء میں مسٹر ہنری لارنس کے مشورہ سے
پرستاران اردو کی طرف سے گورنمنٹ میں اس زبان
کی ترقی کے لیے ایک میموریل کا بھیجا جانا۔ تعلیمی ٹیکس
کے اجرا کی خواہش اور ملک کے مفاد کی خاطر ایک

ایک اردو یونیورسٹی
کے قیام کی گذارش

اکتیسواں باب

۱۸۵۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا (لندن یونیورسٹی کے نمونہ پر) قائم ہونا۔ لارڈ مکالے کی آرزو کا بر آنا مشرقی علوم و زبان سے ہندیوں کا گریز اور انگریزی کی حبّ و خیز۔ اس نئی تعلیم اور نئی زبان کا اثر اور دماغوں میں بدیشی خیالات کا گذر۔

بتیسواں باب

رنگ میں بھنگ۔ اس نئی تعلیم اور نئے اثرات کی بدولت دماغوں کی پستی اور ہندو مسلم رشتہ کی بدبختی الہ آباد کے نیچے الٹی گنگا کا بہنا اور وہاں کے ایک تنور (تندور) سے اردو کے خلاف طوفان کا اٹھنا اور گنگا و جمنا کے سنگم کے پاس دوئی اور ہندو مسلم جدائی کی کالی گھٹا کا چھانا اور خونی اولوں کا برسنا۔ اور اس تخم بینہ کا ترہینی پھاند کر پورب اور گھدیس (بہار) کی زمین پر بھی پڑنا۔ اور خلیج بنگالہ تک اس کے شور کا مچنا۔ اس طوفان بے تمیزی کا زمین بہار کو روندنا اور ناس کرنا۔ اور چند نئے تعلیم یافتہ حضرات کی بدولت وہاں سے اردو کا نکلنا بہار کے شریفوں کا وہاں کے رذیلوں کی بولیاں بولنے پر مجبور ہونا۔ گھدیس کی زبان کا بگڑنا اور بہاریوں کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کا لگنا۔

تینتیسواں باب

اردو کے ساتھ ایسی بدسلوکی کی مخالفت اور گورنمنٹ سے اس کی شکایت۔ میموریل پیر پر میموریل جانا مگر راج ہٹ کے آگے سب کا ردی ہو جانا۔ صدیوں کی یکجائی کے بعد بھائیوں کی جدائی اور اس پر ان کی جگ ہنسائی!! اس موقعہ پر ایک فرنچ درمند کا "باران اسپری ایتوراتی نیسونلینی" (اپنی قومیت کے الگ قائم کرنے کا یہ ایک عجیب طریقہ ہے) کہنا اور دنیا کو اردو کی طرف داری کے لیے کھڑا کرنا!!

چونتیسواں باب

مخالفتوں کے بعد بھی اردو کا بدستور راشٹر بھاشا (ملکی زبان۔ لنگوا فرینکا) بنے رہنا۔ اسے سمجھ کر ملکہ وکٹوریہ کا اردو پڑھنا۔ اور دلی کے لال قلعہ کے بعد ایوان بکنگھم میں پھر اس زبان کے طوطی کا بولنا اور اس پر بادشاہ کی ہندی رعایا کا چہکنا اور اپنی ملکہ کو دعا دینا۔

اردو کا ڈنکا

دھرم کرو، دھرم کرو، اردو کا سنکھ پھونکو۔
اردو کی ڈنڈ مچاؤ۔!!

اعتذار

"مغل اور اردو" ایک مہینے سے بھی کم مدّت میں دن رات کی
مسلسل محنت سے تیار ہو کر آج قدر دانوں کے ہاتھوں
میں ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس کی طباعت
ایسی اعلیٰ نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہئے تھی
مگر ہم کو امید ہے کہ قدرداں
وقت کی قلت پر
نظر فرما کر اس کوتاہی کو معاف کر دیں گے
انشاء اللہ تعالیٰ دوسرے ایڈیشن کی طباعت
کو لیتھو طباعت کا بہترین نمونہ بنانے کی کوشش
میں کسی طرح کمی نہیں کی جائے گی ----------

شائق احمد عثمانی اینڈ سنز پبلشرس
نمبر ۵، ۷ فیرس لین (چونہ گلی) کلکتہ